معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے
پاکستان میں سالانہ دو سو روپے
دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر
بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۹ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۹۷ء عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

مولانا حکیم سید عبدالحئی کی ادبی نکتہ سنجی و سخن فہمی گل رعنا کی روشنی میں — ضیاء الدین اصلاحی — ۲۴۵-۲۶۹

سیرت نبوی پر ایک ہندو کی مراٹھی تصنیف — جناب انیس احمد چشتی، بھولے پٹھ، پونا — ۲۷۰-۲۷۹

امیر الہند نواب محمد علی خاں والاجاہ — جناب عبید اللہ صاحب ایم۔اے (مدراس) — ۲۸۰-۲۹۲

علامہ سید سلیمان ندوی کی خدمات قرآن — پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی — ۲۹۳-۲۹۸

اخبار علمیہ — ع۔ص۔ — ۲۹۹-۳۰۲

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور — جناب شیخ نذیر حسین صاحب، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور — ۳۰۳-

باب التقریظ والانتقاد

سید سلیمان ندوی۔ حیات اور ادبی کارنامے — جناب سبط محمد نقوی صاحب چیف ایڈیٹر ہماری توحید، لکھنؤ — ۳۰۴-۳۰۹

المنتزع من الجزء الاول من الکتاب المعروف بالتاجی — حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق دار المصنفین — ۳۱۰-۳۱۴

ادبیات

غزل — جناب رئیس نعمانی صاحب علی گڑھ — ۳۱۵-

مطبوعات جدیدہ — ع۔ص — ۳۱۶-۳۲۰

شذرات

اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے زیرِ اہتمام ۱۶-۱۷ مارچ ۱۹۹۷ء کو مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء پر ایک بین الاقوامی سمینار ہوا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، بنارس ہندو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، اودھ یونیورسٹی سلطانپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دار العلوم تاج المساجد بھوپال اور مہاراشٹرا و کرناٹک کے اصحاب علم و ادب شریک ہوئے، دار المصنفین شبلی اکیڈمی سے راقم کو اس میں شرکت کی سعادت میسر آئی، سعودی عربیہ کے وزیر اوقاف ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی کی نیابت و نمایندگی سید احمد بن عبدالرحمٰن خلیفہ نے کی جو ہندوستان میں سعودی عربیہ کے سفارتخانے سے وابستہ ہیں۔ افتتاحی جلسہ کی صدارت دنیائے اسلام کے نامور عالم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء اور برصغیر کے مایہ ناز مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی سابق صدر شعبۂ تاریخ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی۔ سابق مرکزی وزیر اور کانگریسی رہنما مسٹر راجیش پائلٹ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لاکر سمینار کی رونق بڑھائی اور اردو زبان سے اپنے لگاؤ کا ثبوت دیا۔

---

۱۶ مارچ کو ۱۱ بجے دن میں افتتاحی جلسہ ہوا، اس میں اکادمی کے وائس چیرمین جناب اطہر نبی ایڈوکیٹ نے اترپردیش اردو اکادمی کی کارگزاری پیش کی، آیندہ کے منصوبے بتائے اور سمینار کے معاونین و شرکا کا شکریہ ادا کیا، اکادمی کے چیرمین پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جس میں اسلامی علوم و فنون کے مختلف دائروں میں ہندوستان کے علماء و مصنفین کے کارہائے نمایاں کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سید عبدالحئی صاحب کی علمی عظمت و بلند پایگی دکھائی۔ مولانا سید عبدالحئی صاحب کے فرزند والاتبار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بتایا کہ ہندوستان کے علماء و فضلاء کے کارنامے دوسرے اسلامی ملکوں سے بڑھکر ہیں لیکن ان کی تصنیفات اور علمی سرگرمیوں اور مسلمان حکمرانوں کے علمی، تمدنی، تعلیمی اور انتظامی کارناموں سے عرب مصنفین عموماً ناواقف تھے، مولانا سید عبدالحئی صاحب نے انکو اپنی بیش بہا تصانیف کے ذریعہ ہندوستانی

کارناموں سے واقف کرایا اور شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا اس طرح اپنے ملک اور اس کی زبان و ادب اور اس کے علم و فن کی اہم خدمت انجام دی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے خطبۂ صدارت میں مولانا کی علمی، دینی اور خاندانی عظمت و وجاہت اور دوسرے متعدد پہلوؤں کا احاطہ بڑے دلکش انداز میں کیا گیا تھا، مسٹر راجیش پائلٹ نے ملک کے بدتر حالات اور سیاستدانوں کی غلط روی پر دکھ ظاہر کرتے ہوئے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ اب لوگوں کو کرپشن اور بدعنوانیوں کا احساس ہونے لگا ہے، انہوں نے ملک میں نفرت و انتشار پھیلا کر اسے کمزور کرنے والوں کے خلاف کمربستہ ہوجانے کی موثر اپیل کی۔

اسی روز سہ پہر کو مقالات کا پہلا جلسہ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی صدارت میں ہوا، جس میں پانچ مقالے پڑھے گئے، ایک مقالہ خود جناب صدر کا تھا، ۱۷ مارچ کو مقالات کا دوسرا جلسہ ۱۰ بجے پروفیسر نثار احمد فاروقی کی صدارت میں ہوا جس میں دس مقالے پڑھے گئے، راقم نے اپنا مضمون اسی جلسہ میں پڑھا۔ سہ پہر کو تیسرے جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد راشد ندوی نے کی، اس میں پانچ مقالے ہوئے، اس دوروزہ سمینار کی نظامت ڈاکٹر شبیر احمد ندوی ریڈر شعبۂ عربی لکھنؤ نے خوش اسلوبی سے کی۔ مقالات کے جلسوں کے بعد ۵ بجے اختتامی جلسہ ہوا جس سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور اترپردیش کے گورنر شری رومیش بھنڈاری نے خطاب کیا، اس موقع پر جناب اطہر نبی وائس چیرمین نے اردو اکادمی کے لیے جو مطالبات پیش کئے، گورنر صاحب نے کم و بیش انہیں منظور فرماکر اپنی اردو دوستی اور اقلیت نوازی کا ثبوت دیا، سمینار کی ساری کارروائی گومتی نگر لکھنؤ میں اکادمی کی شاندار عمارت کے پرشکوہ آڈیٹوریم میں ہوئی، لیکن مولانا سید عبدالحئی صاحب عرصہ تک ندوۃ العلماء کے ناظم رہے اس لیے اس کی جانب سے بھی مندوبین کو آخری روز مغرب بعد شبلی ہال میں ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں مولانا علی میاں مدظلہ، مولانا سید محمد رابع ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور پروفیسر نگرامی کی تقریریں ہوئیں اس تقریب کا اختتام عشائیہ پر ہوا جس میں معززین شہر بھی شریک ہوئے۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب ایک متبحر عالم اور بلند پایہ مصنف تھے انکی اکثر تصنیفات عربی میں ہیں، لیکن اردو زبان

بھی انکی قلمی فیاضیوں سے محروم نہیں رہی۔ تنہا گل رعنا ہی انکے اردو کا اچھا مصنف اور صاحب مذاق ہونے کا ثبوت ہے، اس لیے انکے علمی کمالات و خدمات کا اعتراف مناسب تھا، اتر پردیش اردو اکادمی خصوصاً اسکے حوصلہ مند اور فعال چیرمین پروفیسر محمد یونس نگرامی کی حق شناسی اور قدردانی تحسین کی مستحق ہے جن کے جوش و ولولہ اور سرگرمی و جانفشانی سے یہ سمینار کامیاب ہوا لیکن یہ بات ضرور محسوس کی گئی کہ لکھنؤ جو علم و ادب کا گہوارہ اور اصحاب ذوق کا مرکز ہے انکی اور یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ و طلبہ کی صورتیں مقالات خوانی کی نشستوں میں نظر نہیں آئیں۔ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن اردو والوں اور اکادمی کے ذمہ داروں کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔ سب کے تعاون ہی سے اردو کی خدمت ہوسکتی ہے اور اس کے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ علم و فن اور زبان و ادب پر کسی خاص طبقہ و گروہ کا اجارہ نہیں ہے، افتتاحی و اختتامی جلسوں میں شرکا کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ آڈیٹوریم ناکافی ہوگیا تھا مگر منتظمین نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ مقالوں پر بحث و مذاکرہ کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۱۵ مارچ کو دلی میں پروفیسر عثمان ادہمی کا انتقال ہوگیا، انکا آبائی وطن بستی تھا مگر انہوں نے علی گڑھ میں اپنا مکان تعمیر کرالیا تھا، وہ مسلم یونیورسٹی میں حیاتیات کے پروفیسر تھے۔ انکی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کا اسوقت زیادہ اندازہ ہوا جب وہ سید حامد صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں پراکٹر تھے اور غالباً انہی کی تحریک اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی خواہش پر ادہمی صاحب یونیورسٹی سے سبکدوش ہوکر ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی کے ڈائرکٹر ہوئے، ان کی اور سید صاحب کی مشترکہ جدوجہد سے اس کو چنگ سنٹر سے گزشتہ چھ برسوں میں ستر آئی۔ اے۔ ایس منتخب ہوئے جو ایک بڑا کارنامہ ہے، وہ مولانا آزاد میموریل اکادمی کے صدر بھی تھے جو ایک زمانے میں ان کی جدوجہد سے سرگرم رہی، ادہمی صاحب ایک شریف انسان اور قوم و ملت کے خاموش اور مخلص خادم تھے، وہ نام و نمود اور صلہ و ستائش سے ہمیشہ بے پروا رہے۔ ان کی ذاتی زندگی بھی صاف اور پاکیزہ تھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، متعلقین کو صبر جمیل دے اور ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی اور قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

مقالات

مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ کی ادبی نکتہ سنجی و سخن فہمی گل رعنا کی روشنی میں[1]

از

ضیاء الدین اصلاحی

مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ صاحب کے ذوق میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی تھی، انہوں نے مختلف میدانوں میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے ہیں، اب تو یہ نہیں کہا جاسکتا مگر مولانا کے زمانے تک علماء کا یہ خاص وصف و امتیاز تھا کہ وہ علم و دین میں پختگی و رسوخ کے ساتھ شعر و ادب کے بھی ماہر ہوتے تھے اور اس کا بڑا عمدہ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے اور ان کی قلم رو میں نثر ہی کی طرح نظم بھی داخل ہوتی تھی۔

مولانا سید عبدالحئیؒ صاحب اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ادب میں بلند پایہ رکھتے تھے، انہوں نے بعض وجوہ سے اپنی علمی، تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیوں کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیا اور اس میں ان کے اصل تصنیفی موضوعات تاریخ، تاریخ علوم و فنون، مذہب، تذکرہ و سوانح تھے، جن میں ادبی کمال دکھانے کا موقع کم ہوتا ہے، مگر ان کی سلیس و شگفتہ عربی تحریروں سے ادبی رعنائی و لطافت اور طرز ادا کی دلکشی و دلآویزی پوری طرح عیاں ہے۔

---

[1] یہ مضمون مولانا پر ہونے والے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے سمینار میں، ۱۱؍مارچ ۹۷ء کو پڑھا گیا تھا، اب بعض اضافوں کے ساتھ اسے معارف میں شایع کیا جارہا ہے۔ "ض"

یہی حال ان کی اردو تحریروں کا بھی ہے جو مولانا کی ملکی اور مادری زبان بھی مگر وہ اس کی جانب بس کسی خاص تقریب یا تحریک ہی سے متوجہ ہوتے تھے اور ایسی سلیس، صاف، شیریں اور شگفتہ اردو تحریر ان کے قلم سے نکلتی تھی جو متانت وحلاوت کی لطیف آمیزش اور علمی سنجیدگی کے ساتھ زبان کی چاشنی سے معمور اور ادب وانشا کا دلکش نمونہ ہوتی تھی۔

خالص دینی ماحول میں نشوونما پانے اور ایک متقشف مذہبی عالم ہونے کے باوجود مولانا کو شعر و سخن سے فطری و موروثی[1] ذوق تھا، ابتدا میں وہ فکر سخن بھی فرماتے تھے، اردو، فارسی، اور عربی تینوں زبانوں میں کلام موجود ہے، مگر جوانی گئی تو شاعری کا کوچہ بھی چھوڑ دیا، تاہم ذوق سلیم اور شعر و سخن کا ملکہ خداداد تھا، اپنے پیشہ کی مصروفیت، ندوۃ العلماء کے انتظامی و تعلیمی امور گوناگوں علمی اشتغال اور تصنیفی انہماک بھی شعر و سخن کی دلچسپی کم نہ کر سکا اور ہمیشہ اچھے شعر سے لطف اندوز ہوتے اور اس کی داد بھی دیتے۔

یہاں شاعری میں مولانا کا درجہ و مرتبہ زیر بحث نہیں، دراصل ان کو شعر گوئی سے زیادہ شعر فہمی کا ملکہ تھا اور وہ سخن گو سے بڑھ کر سخن فہم تھے، سخن فہمی، ذوق سلیم، نقد شعر میں بصیرت، زبان و بیان کی آگہی، ادب و بلاغت کی رمز شناسی، نکتہ رسی اور دقیقہ بینی ان کا طرۂ امتیاز ہے، جس کا ثبوت ان کی اردو تصنیف "گل رعنا" ہے جس کو عام طور پر قدیم طرز کا اردو شعرا کا ایک تذکرہ سمجھا جاتا ہے اور یہ بیجا بھی نہیں، تاہم اس کے چند اور امتیازات و خصوصیات بھی ہیں جن کی طرف شروع ہی میں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔

---

[1] ان کے والد بزرگوار مولانا فخرالدین خیالی ایک قادرالکلام شاعر، مورخ اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، ان کا سب سے اہم کارنامہ مہر جہاں تاب ہے جس کے ایک دفتر میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا شاعروں کے تذکرے علیحدہ علیحدہ درج کیے ہیں۔

مولانا کے بچپن میں ان کے اکثر خاندانی بزرگوں کے پاس بیاض ہوتی تھی اور جو جس مذاق کا ہوتا تھا اس کی بیاض بھی اسی نوعیت کی ہوتی تھی، یہ دیکھ کر ان کو بھی بیاض بنانے کا شوق ہوا، گو ان کا اصل پیشہ طبابت تھا مگر ان پر شعر و ادب، نقد شعر اور سخن فہمی کا ذوق غالب تھا اس لیے وہ اپنی بیاض میں اپنے دور تک کے خاص خاص شعراء کے اچھے اور اپنے پسندیدہ اشعار نقل کرتے رہے۔

پچیس تیس برس کی عمر تک یہ شغل جاری رہا، اس کے بعد علمی و تعلیمی مصروفیتیں اور تصنیفی مشاغل بڑھ جانے کی وجہ سے بیاض پس پشت ہوگئی، البتہ انتقال سے دو تین برس پہلے نقرس، وجع مفاصل اور دوسری بیماریوں کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور اور مطالعہ و تصنیف سے محروم ہو گئے جو ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور اس کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے، اس زمانے میں ان کو ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی جن سے دماغ پر زیادہ زور نہ پڑے، اتفاق سے اسی تلاش و جستجو میں یہ بیاض ہاتھ لگی جسے دیکھ کر خیال ہوا کہ اس میں مشہور شاعروں کا کلام اتنا جمع ہو گیا ہے کہ اسے ترتیب دے کر اور اس میں شعراء کے مختصر حالات کا اضافہ کر کے شائع کر دیا جائے تو قارئین کی دلچسپی کا سامان ہوگا۔ اس مقصد سے مختلف تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا تو یہ خاصی کتاب وجود میں آگئی (دیباچہ کتاب ص۳)

مولانا عبدالحئی صاحب نے شعراء کے حالات قلمبند کرنے کے لیے جب تذکروں اور مراجع کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو ان میں ان کو جہاں تشنگی اور کمی یا رنگ آمیزی اور غلط بیانی نظر آئی ان کی اصلاح و تصحیح بھی فرما دی، اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کا یہ بیان قابل توجہ ہے:-

"جب سے انجمن ترقی اردو کی کوشش سے اردو کے قدیم تذکرے چھپنے لگے ہیں، آب حیات کے بعض بیانات غلط ثابت ہو رہے ہیں، اس کے بعد سے اب تک تنقیدوں کا سلسلہ جاری ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم، مولوی عبدالحق بابائے اردو شیخ چاند مصنف سودا، مولانا عبدالحئی مصنف گل رعنا اور پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کو آب حیات کے نقادوں میں بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"مولانا عبدالحئی نے بھی کم و بیش تیس چالیس موقعوں پر آزاد سے اختلاف کیا ہے... جس قدر انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے اور نئی نئی باتیں دریافت ہوتی جاتی ہیں، اسی قدر پرانی کتابوں میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش زیادہ ہوتی جاتی ہے اور ایک لحاظ سے یہ بہت اچھی بات ہے، کیونکہ اس سے کتابوں کے داغ دھل جاتے ہیں اور نقائص کم ہو کر خوبیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔" (شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن ص۳۰۰ شایع کردہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲ء)

یہ صحیح ہے کہ آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح خاص طور پر گل رعنا میں کی گئی ہے لیکن دوسرے تذکرہ نگاروں کے بعض خیالات سے اختلاف و اتفاق کی مثالیں بھی اس میں موجود ہیں، مثلاً میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں شعرائے دکن کا ذکر میر عبدالولی عزلت کی بیاض سے نقل کیا ہے مگر مصنف گل رعنا کو ان سے اولاً تو یہ شکایت ہے کہ حال تو کچھ لکھا نہیں کسی کے ایک دو شعر، کسی کے کچھ زیادہ لکھے ہیں ثانیاً ان کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یوں نقل کی ہے:

"بیکے از شاعران سمت دکن کہ بے رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولی و سید عبدالولی و

سراج و آزاد کہ معاصر ولی بود سر رشتہ مضبوط گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود باقی سر کلانہ داشت اند" (ص۸۶)

یہ عبارت گنجلک ہے، ڈاکٹر محمود الٰہی نے نکات الشعرا کو از سر نو ایڈٹ کر کے شایع کیا ہے اس میں یہ عبارت اس طرح ہے:

"مخفی نماند کہ شاعران سمت ملک دکن اکثر بے رتبہ اند مگر بعضے چنانچہ ولی محمد کہ صاحب دیوان مشہور و معروف است و سید عبدالولی عزلت و سراج و آزاد کہ ہم عصر ولی بود و عارف علی خاں عاجز کہ سر رشتہ مربوط گوئی بدست ایشاں افتادہ است و باقی ہمہ درست حرف زدن نمی دانستند تا بہ شعر گوئی چہ نسبت لہٰذا بہ اشعار اکثر آنہا اکتفا کردہ نوشتہ می آید۔" (ص۹۰)

اب میر صاحب کے اس بیان پر مصنف گل رعنا نے جو ردوکد کی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے!

"میر صاحب نے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے اور جو کلام ان کا انہیں ملا ہے اس کے لحاظ سے یہ رائے ان کی صحیح ہو تو ہو مگر اصلیت اور واقعہ کے اعتبار سے غلط اور بالکل غلط ہے، میر صاحب نے دکن کے سینکڑوں شعرا میں سے کم و بیش پچیس شاعر کا ذکر کیا ہے، ان سینکڑوں میں بیسیوں ایسے ہیں جو میر عبدالولی عزلت سے بہتر شعر کہتے ہیں۔

کسی کے ایک دو شعر پڑھ کر اس کی نسبت جو رائے قائم کی جائے گی وہ اصلیت سے دور ہوگی، مرزا داؤد کا صرف ایک شعر میر صاحب کو ملا ہے، حالانکہ ان کے دیوان میں پانسو شعر سے کم نہیں، اگر تم اسی ایک شعر کو پڑھ کر سارے دیوان کو خرافات کہہ دو

تو اس سے زیادہ زبردستی کیا ہو سکتی ہے،

جن لوگوں کی خبر میر صاحب کو نہیں ہوئی، ان میں سے میر عاشق علی خاں ایماؔ، میر غلام علی ارشدؔ، مرزا علی نقی خاں ایجادؔ، میر عبدالحئی خاں صارمؔ، عارف الدین عاجزؔ، میر اولاد محمد ذکاؔ، لچھمی نراین شفیقؔ اور بہت سے ایسے شعرا ہیں جن کے ہاں زبان کی صفائی، خیالات کی رنگینی اور پختگی کلام کے تمام لوازم موجود ہیں۔" (گل رعنا ص۸۶-۸۹، طبع پنجم، عکسی اڈیشن)

میر قدرت اللہ قدرت کو میر تقی میر نے عاجز سخن بتایا ہے اور نکات الشعرا میں ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے، مصنف گل رعنا تحریر فرماتے ہیں:

"ممکن ہے کہ قدرت کا بہترین کلام میر صاحب تک نہ پہنچا ہو یا ان کی کسی بات پر چڑھ گئے ہوں اور ان کو یاران بزم میں شریک کرنا پسند نہ کرتے ہوں، قدرت کے قادر الکلام ہونے میں کچھ شک نہیں، ایسے شخص کو عاجز سخن کہنا میر صاحب کی زبردستی ہے" (ص۲۰۹)

انعام اللہ خاں یقین حضرت مرزا مظہر کے شاگرد رشید تھے، میر صاحب ان سے بہت خفا ہیں، مصنف گل رعنا نکات الشعرا سے ان کا بیان نقل کر کے اس پر یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"میر صاحب کی زبردستی دیکھو۔ یقین کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ شہادت ہے، ایسے سخن گو کی سخن فہمی کا انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے اچھا نہیں لگتا، اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کچھ لوگ سرے سے یقین کے کلام کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقین کو شعر کہنا ہی نہیں آتا تھا" (ص۱۹۲)

آزاد اور میر صاحب ہی پر موقوف نہیں وہ دوسرے تذکرہ نگاروں کی غلط بیانی کی اصلاح بھی کرتے ہیں، میر حسن نے میر محمد حسین کلیم دہلوی کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ در ہندی

نثر کتاب نیز ایجاد کردہ" مصنف گل رعنا اس کی تصحیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کسی نے نثر اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی، مگر یہ صحیح نہیں، مقدمہ میں میں نے بیان کیا ہے کہ فضلی نے دہ مجلس ۱۱۴۵ھ میں لکھی تھی" (ص۲۱۱)

اس کی مزید تفصیل کی گنجائش نہیں، ہمارا مقصد یہ دکھانا ہے کہ گل رعنا میں آب حیات کی طرح دوسرے تذکرہ نگاروں کے غلط آرا و خیالات کی بھی تصحیح کی گئی ہے۔ جو اس بات کا نتیجہ ہے کہ مصنف کی اردو شاعری پر وسیع و عمیق نظر ہے اور وہ اس کا اچھا مذاق رکھنے کے علاوہ نکتہ سنج اور سخن فہم بھی تھے۔

دوسری اہم چیز کتاب کا عالمانہ و محققانہ مقدمہ ہے جس میں اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور ان کے عہد بعہد ارتقا کا حال بیان کیا گیا ہے، مصنف نے دراصل اس کتاب کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے اور ہر ہر طبقہ کو تین دور میں منقسم کیا ہے، مقدمہ میں ہر طبقہ و دور کے اہم اور نمایاں شعرا کے امتیازات اور ہر دور کی ممتاز خصوصیات اور زبان و شاعری میں ہونے والی اصلاحات و تعبیرات پر مبسوط تبصرہ کر کے شعر و ادب میں اپنی قابلیت، وسعت نظر، پختگی اور مذاق سخن کی بلندی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اسی لیے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف لطیف شعر الہند کے ضمن میں اسکے ساتھ ہی گل رعنا کی بھی یہ خصوصیت بتائی ہے:

"اور مثل مولوی حکیم عبدالحئی صاحب مرحوم کے گل رعنا کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے، اس میں بعض خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں" (تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص۳، تیج کمار بکڈپو، لکھنؤ)

اور خود مصنف شعر الہند مولانا عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں:

"اس زمانے میں یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اردو کے تمام مشہور اساتذہ کے حالات میں ایک مبسوط اور محققانہ تذکرہ مرتب کیا جائے اور اس میں ان تمام اساتذہ کے کلام پر تبصرہ ہو جنھوں نے اردو شاعری کو ترقی دی ہے، مولانا عبدالحیٔ صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء نے اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر ایک مبسوط تذکرہ "گل رعنا" کے نام سے مرتب فرمایا تھا جو آج ان کی وفات کے دو سال بعد دارالمصنفین کی طرف سے شایع ہو رہا ہے، اس میں سب سے پہلے اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ درج کی گئی، اس کے بعد شعرائے دکن کا تذکرہ ہے، پھر ہر دور کے شعراء کے حالات ہیں جن کا خاتمہ اساتذہ دور جدید مثلاً مولانا حالی اور سید اکبر حسین وغیرہ پر ہوا ہے"۔ (شذرات معارف جنوری ۱۹۲۵ء)

اس وضاحت کا مقصد بھی یہ ہے کہ گل رعنا محض ایک عام تذکرہ نہیں ہے بلکہ مستند تذکرہ ہے جس میں شاعری اور اردو زبان کی تاریخ اور اس میں عہد بعہد کے تغیرات و اصلاحات اور ہر دور کے اساتذہ سخن کے خصوصیات کلام پر عالمانہ و ماہرانہ تبصرہ ہے، جس سے مصنف کی اردو زبان و شاعری سے غیر معمولی واقفیت و اطلاع اور شعر و سخن کے اداشناس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

تیسری مفید اور بیش قیمت چیز گل رعنا کے محققانہ حواشی ہیں جن میں اس کے متن میں وارد اشخاص و رجال کے متعلق گوناگوں اطلاعات و معلومات فراہم کیے گئے ہیں ان میں شاعر و ادیب اور دوسرے طبقوں کے اہل کمال اور سلاطین و امرا کا مستند حال بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی ان کے حسن ذوق اور بالغ نظری کا ثبوت ہیں۔

گل رعنا کی چوتھی اور بڑی اہم خصوصیت مصنف کی سخن فہمی، شعری و ادبی بصیرت،

بلاغت شناسی، دیدہ وری، نکتہ رسی اور شعر و ادب سے لطف لینے اور اس کی داد دینے کی صلاحیت ہے، چنانچہ خود مصنف اپنے دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

"امید ہے کہ بزرگان سخن فہم اس کی قدر فرمائیں گے"۔ (ص ۲)

بلاشبہ بعض بزرگان سخن فہم نے اس کی قدر افزائی کی، مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں:

"عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے... ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے جس سے فاضل مولف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے... ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے" (رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء)

یہی منصفانہ رائے کا اظہار اس کا ثبوت ہے کہ ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے ایک مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اپنے پہلو میں بیٹھا کر فرمایا:

"کتاب (گل رعنا) پڑھ کر ہی معلوم ہوا کہ مولانا کو سخن فہمی اور ادب و شاعری کا ایسا ذوق عطا ہوا ہے"۔ (حیات عبدالحیٔ ص ۲۲۳)

مولانا شروانی ان کے ذوق ادب و شعر اور سخن فہمی کے ایسے معترف تھے کہ ان کے پاس اپنی غزلیں بھیجتے تھے، ایک دفعہ ان کو اپنی کوئی فارسی غزل بھیجی مولانا نے شاید تواضعاً نواب صاحب کو لکھا ہوگا کہ میری تحسین، تحسین ناشناس ہوگی، اس کے جواب میں نواب صاحب فرماتے ہیں:

"آپ سخن ناشناس ہیں تو سخن شناس کون ہوگا، صاحب ذوق سلیم جس کے دل میں درد

کی چاشنی ہو ضرور شعر فہم ہوگا، ذوق نہ ہوتا تو قند پارسی کیوں کام بخش ہوتا۔ درد نہ ہوتا تو خاک رہ جاناں کی حسرت دل میں کس طرح ہوتی، ذوق ہم دردی درد آ آہنگی کی سلسلہ جنبانی کرتا ہے، نوائے دل پر توجہ فرمایئے کہ کس پردہ سے اٹھ رہی ہے"۔

(حیات عبدالحئی ص ۲۲۵)

مولانا عبدالحئی صاحب کے فخر روزگار فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جن کا شعری و ادبی ذوق بہت عمدہ اور رچا ہوا ہے، حیات عبدالحئی میں جابجا ان کے ذوق سلیم اور ملکہ سخن فہمی کی توثیق کی ہے، مولانا کے عہد و ماحول کا تذکرہ کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اس ماحول اور اس انداز کی تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوق سلیم اور سخن فہمی کا مذاق صحیح نہ پیدا ہونا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعرا کا ایک تذکرہ مرتب ہوا جو ان کی زندگی کے بعد "گل رعنا" کے نام سے شائع ہوا"۔ (حیات عبدالحئی ص ۳۱۴)

ایک جگہ مولانا کے مختلف و متضاد اوصاف و کمالات یوں بیان فرماتے ہیں:

"قدیم ماحول، خالص دینی تعلیم اور دولت باطنی کے ساتھ ادب و انشا اور شعر و شاعری کا اعلیٰ مذاق اور نقد سخن کا ملکہ راسخ"۔ (حیات عبدالحئی ص ۳)

ایک جگہ مولانا کی اسی خصوصیت کو یوں نمایاں کیا ہے:

"آپ کا کمال اور جوہر سخن فہمی کا ملکہ خداداد ہے، تاریخ نکالنے کی آپ نے مشق نہیں کی تھی مگر نکالتے تھے تو خوب نکالتے تھے"۔ (حیات عبدالحئی ص ۲۵۱)

ان خارجی شہادتوں کے بعد وقت آگیا ہے کہ اب ہم خود گل رعنا کی داخلی شہادتوں سے مولانا کی شعر فہمی کے کمال اور ادبی نکتہ رسی کے جوہر کو دکھائیں۔

مقدمہ میں مولانا نے اردو شاعری کے تین طبقے قائم کیے اور ہر طبقہ کو تین تین دور میں تقسیم کیا ہے، اسی طبقہ و دور بندی کے لحاظ سے اصل کتاب میں شعرا کا تذکرہ لکھا اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے، مقدمہ میں طبقات کی تقسیم سے پہلے وہ اردو شاعری کی حقیقت سناتے اور اس کا مرکز ثقل دکن سے دہلی منتقل ہونے کا ذکر کرتے ہیں، اس میں ایک ہی شاعر کے دو مختلف پیرایہ بیان یا جدا جدا رنگ و انداز کی نشاندہی کرتے ہیں، اس سے ان کے سخن فہمی کے ملکہ خداداد کا اندازہ ہوتا ہے، پہلے ہم اسی بحث کو لیتے ہیں۔

اردو کا مرکز ثقل جس زمانے میں دکن سے دہلی منتقل ہوا، اسی زمانے کے ایک بڑے شاعر قزلباش خاں امید تھے، اہل ہند کے ساتھ ان کی گرم جوشیاں مشہور ہیں، ان کا قیام پہلے اورنگ آباد میں رہا، پھر یہ دہلی آئے، مولانا پہلے ان کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

بامن کی بیتی آج مری آنکھ مون پہ ہے — غصہ کیا دگالی دیا و روگر کر[1] (گل رعنا ص ۲۹)

پھر آگے انہی کے یہ دو شعر بھی نقل کیے ہیں:

درو دیوار سے اب صحبت ہے — یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تری آنکھوں کو ڈرتا ہوں — الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں (ایضاً ص ۳۰)

ایک ہی شاعر کے یہاں دو طرح کا رنگ کیوں پیدا ہوا مولانا کی نکتہ شناس طبیعت اور اردو شاعری کے رنگ و آہنگ سے آشنا ذہن نے اس کی یہ وجہ بتائی ہے:

"ان تینوں کو ملا کر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر کسی اور کا ہے یا پچھلے دو شعر امید کے نہیں ہیں، مگر یہ تینوں شعر ان ہی کے ہیں۔ پہلا شعر اس وقت کا ہے جب ان کو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور یہ دکن میں تھے، ہندوستان میں رہتے رہتے زبان اتنی

[1] آخری لفظ پڑھا نہیں گیا۔

صاف ہوگئی تھی کہ یہ دو شعر نہایت صاف اور سادہ کہہ سکے، میر تقی میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شعر دلی کی کمائی ہے۔" (ص ۱۹۳ و ۳۱۰)

ہر شاعر کا رنگ سخن جدا اور طرز ادا مختلف ہوتا ہے، بعض شعراء کے طرز کلام کا فرق دقیق ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے مگر بعض بعض کے کلام کا فرق بہت نمایاں ہوتا ہے، شیخ محمد ابراہیم ذوق بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے، دونوں کے کلام میں وہی فرق ہے جو استاد اور شاگرد کے کلام میں ہوتا ہے، اس کے باوجود شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کا شاگرد کے دواوین کو سرتاپا استاد کا طبع زاد بتانا سخت عجیب ہے مصنفِ گل رعنا نے اس کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی سخن شناسی اور صحت مذاق ہی کا نہیں حقیقت شناسی اور انصاف پسندی کا بھی ثبوت ہے، ملاحظہ ہو:

" لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کی شکل میں شایع ہو چکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی۔ ذوق پھر بھی ذوق ہیں، ظفر کے استاد۔ ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، انکی باتیں ان کے ساتھ ہیں۔ ظفر کے ہاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی مگر جوش و خروش کی جگہ دل وجگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انہیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا۔" (گل رعنا ص ۲۹۰)

مولانا نے بعض شاعروں کے اشعار کے عیب و ہنر اور ان کی خوبی و خامی اور حسن و قبح دکھائے ہیں، اس سے ان کے مذاق سخن کی بلندی اور شعر فہمی کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔

کبھی صرف ایک دو فقرہ لکھ کر اپنی تحسین ظاہر کر دی ہے جس کے بعد شعر نقل کیا ہے، اسے پڑھنے سے واقعی ان کے کمال سخن سے آشنا ہونے کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے مثلاً مرزا مرتضیٰ قلی فراق فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے، ان کے بارے میں لکھتے ہیں "اردو میں فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں" پھر یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے ‏ ‏ کہ یاں اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے
اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں ‏ ‏ کوئی ان ہم نواؤں سے ہمیں یاد کرتا ہے

مومن و غالب کے طرز ادا کی ایک خاص خوبی یہ بتائی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اس جز کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، مگر مولانا عبدالحئی صاحب اس سے آگاہ فرماتے ہیں کہ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے[1] جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے، مولانا نے

---

[1] مولانا عبدالحئی صاحب نے حکیم مومن خاں کے تذکرہ میں ان کی اس خصوصیت کے بارہ میں لکھا ہے "ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے (بقیہ حاشیہ ص ۲۵۸ پر)

مومن خاں کے بعض اشعار کو اکثر اسی پیچیدگی پر مبنی قرار دیا ہے اور مثال میں ان کا یہ شعر نقل کیا ہے:

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

مولانا کی تشریح ملاحظہ کیجیے:

"کنایہ ہے کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، اس لیے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں مگر جب تک یہ جملہ کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، بڑھایا نہ جائے عام ذہن معنی مقصود کی طرف منتقل نہیں ہوتا، مگر شاعر نے اس کے ذکر نہ کرنے میں لطافت رکھی ہے کہ اس نے گویا قصداً ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اسکے جتانے کی کچھ ضرورت نہیں" (گل رعنا ص ۶۴)

مصنفِ گل رعنا نے طبقہ متاخرین کے دور اول کے شعرا امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش اور ان کے متبعین کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ انہوں نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں وہ حد اعتدال سے گزر گئے۔ صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام کو اتنے ایچ پیچ میں ڈال دیا ہے کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے کھولتے مطلب غائب ہو جاتا ہے اور اکثر کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثل اس پر ٹھیک اترتی ہے، خواجہ آتش کے یہاں صاف تشبیہیں، استعارے اور حسن تعلیل کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں مثلاً:

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۰) جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں کاوشِ فکر کی ضرورت پڑتی ہے" (ص ۳۶)

صبحِ بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حسن کی
شبرنگ مردمک نہیں بھنورا کنول میں ہے

غنچے شگفتہ ہوتے ہیں آئی ہے فصل گل
کپڑوں کو پھاڑنے کی بہار آجکل میں ہے

مے گلرنگ سے جھلکی جو سرخی پان کی اس میں
گلوئے یار پہ عالم ہوا شیشہ کی گردن کا

صیاد حسن کھیلتا ہے جب شکار عشق
بلبل کو پھانستا ہے رگ گل کے دام سے

اے مرغِ دل ہے فاصلہ اس زلف و خال میں
دانہ ترے نصیب کا باہر ہے دام سے

فصل بہار آئی مبارک ہوائے جنوں
خار اور آبلہ سے ملاقات راہ کی

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مگر ان کے حریف شیخ امام بخش ناسخ اپنی دقت پسندی کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں، سیدھی بات بہت کم کہتے ہیں، کہتے بھی ہیں تو بے مزہ کہتے ہیں، آئیے مولانا کی سخن فہمی کا تماشا دیکھنے کے لیے ناسخ کے کچھ اشعار پر ان کا نقد و تبصرہ دیکھیں، شیخ ناسخ کا شعر ہے:

ابھی ہر چند وہ بت نوجواں ہے
سفید اس کا مگر موئے میاں ہے

مصنفِ گل رعنا فرماتے ہیں:

"حسب معمول کمر کو بال سے تشبیہ دی، پھر بال کے اوصاف اس کے لیے ثابت کرکے بدن کے لحاظ سے کمر کو سفید قرار دیا ہے، پھر کمر کا بال سے استعارہ کرکے اسکی سفیدی پر اظہار تعجب کر دیا، ان نکتہ آفرینیوں کے بعد مطلب یہ نکلا کہ بال بڑھاپے میں سفید ہوا کرتے ہیں، مگر تعجب ہے کہ معشوق کا بال جوانی میں سفید ہو گیا" (ص [illegible])

مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ اس بدمزہ مضمون کو بیسیوں جگہ متعدد طریقے سے ادا کیا ہے، ایک جگہ یوں فرماتے ہیں:

آرایش جمال خداداد عیب ہے
موئے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا

چند اور مثالوں سے مولانا کی شعر فہمی اور نکتہ وری کا کمال دیکھو، فرماتے ہیں:

ایک جگہ چاند کہ سات سیاروں میں سے ایک وہ بھی ہے۔ خانہ نشیں بنا کر اس کو ثابت فرض کیا، پھر گھر سے نکال کر اس کے سیارہ ہونے پر اظہار تعجب کرتے ہیں۔

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا
اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا

مصنف گل رعنا لکھتے ہیں:

"معشوق کی آنکھ کو بہ لحاظ وحشت چشم غزال سے تشبیہ دی جاتی ہے، انھوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ پہلے تو آنکھ کا استعارہ غزال چشم سے کیا، چونکہ وہ جانور ہے اس لیے اس کے واسطے چارے کی بھی فکر کرنی پڑی۔"

چشم بد دور آج آتے ہیں نظر رخسار صاف
سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

اسی مضمون کو خواجہ آتش نے بھی باندھا ہے مگر طرز ادا نے ان کے شعر کو کس قدر مزے دار کر دیا۔

خط پہ جو آئینہ میں پڑتی ہے نگاہ یار
آہوئے چشم مست ہیں سبزہ چرے ہوئے

رنگ اڑنے کو طیر اور رنگ حنا کو طائر سے تشبیہ دینا ایک معمولی بات ہے، شیخ صاحب نے اس سے یہ بات نکالی ہے کہ طائر بھی تو جانور ہے، ذبح ہوتے وقت تڑپنا، لوٹنا اس کا خاص وصف ہے، یہ وصف انہوں نے طائر رنگ کے لیے بھی ثابت کر چھوڑا۔

اس ادا سے باڑھ دیکھی آپ نے تلوار کی
طائر رنگ حنا بھی طائر بسمل ہوا

مولانا عبدالحئی صاحب ان کے دیوان کو اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے بھرا ہوا بتاتے ہیں تاہم بحکم انصاف شیوۂ ایست کہ بالائے طاعت است

اس لیے مولانا کے خیال میں جہاں کہیں دقت آفرینی سے کام نہیں لیتے تشبیہ و تمثیل میں اچھے اچھے شعر بھی نکالتے ہیں مثلاً

آزاد ہیں قیود سے افتادگان خاک
اڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند
آسماں پیش زمیں بہر تواضع خم ہوا

طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہے عجب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

کیا روز بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

مشک میں خوشبو ہے پیچ و تاب مثل مو نہیں
پیچ ہیں سنبل میں مثل مو مگر خوشبو نہیں

عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں
نشہ ہے جام مے الفت میں لیکن بو نہیں

مسی آلودہ لب پہ رنگ پان ہے
تماشا ہے تہہ آتش دھواں ہے
(ایضاً)

برمحل اشعار | مولانا اپنی تحریروں میں جہاں کوئی شعر نقل کرتے ہیں وہ نگینے کی طرح جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سیاق و سباق اور اپنے موقع کے لحاظ سے نہایت موزوں، مناسب اور برمحل ہوتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر و ادب کے بڑے نکتہ شناس اور اچھے سخن فہم تھے۔ چند مثالوں سے اس کی تصدیق ہو جائے گی۔

گل رعنا دراصل شعراء کے کلام کا انتخاب ہے اس لیے اس میں اس کا موقع کم تھا۔ تاہم جہاں کہیں کسی موقع سے کوئی شعر آگیا ہے تو اسے پڑھ کر طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔

مولانا کو شکایت ہے اور بجا شکایت ہے کہ متاخرین کے دور میں آکر شاعری کا معیار پست اور زبوں ہو گیا ہے، غزل نری لفاظی بن گئی ہے اور خیالات میں تازگی مفقود ہو گئی ہے، اس لیے ان کے کلام میں کسی قسم کا ولولہ اور جوش بہت کم پایا جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ "اگر یہ لوگ اپنے کلام کو اپنے خیالات و جذبات کا آرگن بناتے تو اس کا بہت

عمدہ اثر پڑتا اور ان کو اپنے اساتذہ کی پیروی کرنے پر قناعت نہ کرنی پڑتی اور اسیر لکھنوی کا یہ شعر ان کے حسبِ حال نہ ہوتا۔

شاعرانِ حال کیا مضمونِ نو پائیں اسیرؔ
ڈھونڈھتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں
(ص۹۲)

بہادر شاہ ظفر کے دادا شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان کی سلطنت جا چکی تھی، وہ ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے اور ان کی حکومت دہلی میں قلعۂ معلی کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں "لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی اور اردوئے معلی ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے اس کو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخش دیا"۔ اس موقع پر یہ شعر پیش کیا ہے جو کس قدر موزوں اور حسب حال ہے:-

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را
(ص۹۶)

آگے پھر لکھتے ہیں "اس بدنصیب بادشاہ کی ساری زندگی روتی جھینکتی گذری، دلوں کے ارمان دل ہی میں رہے، سلطنت کا خواب جو دیکھا تھا، اس کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قلعۂ معلی سے بھی نکال کر رنگون پھینک دیے گئے"، اس موقع پر یہ شعر انکے نوک قلم پر آ گیا ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

یہی نہیں آگے کی سنیئے "جوان جوان بیٹے اور پوتے ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر کے گولی مار دیے گئے، طوق و سلاسل اور خدا جانے کیا کیا جو کچھ بھی اس منحوس شاعری کی بدولت ان کو ہوس ہوتی ہوگی وہ سب نکل گئی اور جتنے دنوں کی زندگی تھی رنگون کے بلاخانے میں بے بسی و بے کسی کے ساتھ پوری کر کے ۱۲۷۹ھ میں پیوند خاک ہو گئے، اب کوئی یہ بھی

نہیں جانتا کہ ان کو گور کفن ملا بھی یا نہیں"۔ اس موقع پر مصنف گل رعنا کو تسلیم کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

نہ شامیانہ، نہ شمعِ تربت، نہ موج سبزہ، نہ چادرِ گل
بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہے بے کسی کی

مرزا مظہر جان جاناں کے قتل کا واقعہ تحریر کرنے کے بعد ان کے لوح مزار پر خود انہی کا جو شعر کندہ ہے اسے برمحل نقل کر کے اس کی تصریح کرتے ہیں کہ لوح مزار پر اس کا کندہ ہونا حسبِ حال ہے اور صحیح پیشین گوئی ہے۔

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے
(ص۱۳۲)

اور اس سیاق میں کہ سودا ہجو گوئی کے مرد میدان تھے، ان کے ہم عصروں میں سے میر تقی میرؔ، میر ضاحک، فدوی، ندرت اور بقاؔ نے بھی اس کوچہ کی خاک اڑائی ہے، اس موقع پر یہ مصرعہ ؏ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ کتنا برمحل اور مناسب ہے۔

یاد ایام یا تاریخ گجرات محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی فرمایش پر لکھا گیا طویل مقالہ ہے، اس میں گجرات کے اسلامی عہد کی علمی، تمدنی اور مذہبی تصویر کھینچی گئی ہے اور گجرات کے فرمانرواؤں کی حکمرانی کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اس میں اشعار نقل کرنے کا موقع نہیں تھا، لیکن گجرات کے اسلامی دور کی یاد نے مولانا کے زخم کہن تازہ کر دیے اور اس کی ابتدا و انتہا شعروں ہی سے ہوئی ہے اور بہت خوب ہوئی ہے۔ پہلے ابتدا کا شعر ملاحظہ ہو جو بہت حسبِ حال ہے۔

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

اور آخر کے دو شعر سننے سے پہلے اس کا پس منظر ملاحظہ ہو، گجرات کی عظمت و شوکت کی داستان سنانے کے بعد مولانا اس کے موجودہ باشندوں سے سوال کرتے ہیں:-

"مگر اے اہلِ گجرات! خدارا انصاف کیجئے! کیا اب بھی آپ کے ملک سے ایسے جوہر قابل نکلتے ہیں جو علامہ وجیہ الدین اور شیخ محمد طاہر محدث نہ سہی، سید جلال رضوی اور قاضی عبدالوہاب کی یادگار سمجھے جانے کے مستحق ہوں، آپ کہیں گے کہ اب اس کا زمانہ نہیں، نہیں ہے تو جانے دو، میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں کوئی ہے جو دادا بھائی نوروجی اور مسٹر گاندھی کا جواب ہو، کہو نہیں"۔

اور پھر یہ اشعار پڑھیے اور مولانا کی سخن فہمی و نکتہ سنجی کا اندازہ کیجیے،

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں اک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ وہاں گل تھا

مولانا ندوۃ العلماء کے عرصہ دراز تک ناظم رہے، اس کے سالانہ جلسوں میں ان کو گزشتہ سال کی روداد پیش کرنی پڑتی تھی، روداد عام طور پر خشک و بے مزہ ہوتی ہے، لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

"بہت سے ایسے حصے بھی ہوتے تھے جو اہلِ علم اور ادب کے ذائقہ شناسوں کے لیے نہ صرف دلچسپ بلکہ معلومات افزا ہوتے تھے، خصوصاً جب جلسہ کسی ایسے مقام پر ہوتا جس سے مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ و تہذیب کا دور وابستہ ہوتا تو ان کے داغِ کہن تازہ ہو جاتے اور ان کا تاریخی و علمی ذوق ان کی عنان قلم کو بے اختیار عہد ماضی کی طرف موڑ دیتا" (حیات عبدالحی ص ۱۹۹-۱۹۵)

ایسا ہی ایک اجلاس بلگام میں ہوا تو شاہان بیجاپور کی ہنر پروری اور علم دوستی کا ذکر کرنے لگے جس نے اس سرزمین کے ایک ایک ذرہ کو رو کش آفتاب بنا دیا تھا، خصوصاً خسرو اسد خاں کے کارنامے ان کی زبان قلم پر آگئے، جس کی سیر چشمی و فیاضی، تدبر و دانشمندی سے

بلگام بڑے بڑے متمدن شہروں کا ہمسر ہو گیا تھا۔ اسی سیاق میں مولانا کو یہ شعر بھی یاد آتا ہے کہ:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

انتخاب اشعار گل رعنا میں مشہور شعراء کا منتخب کلام پیش کرنا ہی مصنف کا اصل مقصد ہے اور یہ انتخاب بڑی خوش ذوقی سے کیا گیا ہے، طوالت کے خوف سے مثالیں پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ ناظرین کتاب کی ورق گردانی کر کے مصنف کے حسن ذوق، نکتہ شناسی اور شعر فہمی کا اندازہ کر سکتے ہیں، گل رعنا کے حواشی بھی بہت مفید اور پُر از معلومات ہیں، ان میں بھی متن میں وارد اشخاص کے اشعار کا انتخاب کہیں کہیں دیا گیا ہے، اسی سے بعض مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

شمس ولی اللہ کے ہم عصر ایک بزرگ سید محمد جمال الدین قادری تھے، خاکی تخلص تھا، مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کو اول سے آخر تک عارفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا پایا ہے ان کا مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانہ میں موجود تھا، ان کی مہربانی سے خاکی کے دیوان کے کچھ منتخب اشعار مصنف کو ملے جن کو ملاحظہ طلب کہہ کر نذر قارئین کیا ہے، اس سے دونوں بزرگوں کی شعری بصیرت اور سخن فہمی آشکارا ہے۔

جائز نہیں تھی ہجر کے شب کی شکایتیں مجنوں خصوص آج تو نقد وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا ایک دل ایک رنگ ہو رہنا

خوش یہی حال ہے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

جن نے مے کو پیا کے نوش کیا اس کے حق میں ہوا ہے شربت تلخ (ص۱۰ حاشیہ)

اور اب نواب آصف الدولہ کے کلام کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو:

آصف نہ چھٹے عشق بتاں دل سے ہمارے　　سو بار اگر پھر بھی بنا دیں اسے گھڑ کر

شوخیِ چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر　　شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں

جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے　　آبِ آتش ہوئے کیوں کر بہم کیا جانیے

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو　　میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح　　ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے (ص۱۰۵)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ پر قدرے طویل حاشیہ ہے، یہ بقول مصنفِ گلِ رعنا سرمایۂ نازش ہندوستان، فضل و کمال اور فنون ادبیہ کی بے نظیر قابلیت میں اپنا آپ جواب تھے، سرزمینِ ہند میں جامعیت کے دو ہی چار شخص ہوئے ہوں گے۔ سید آثار الصنادید میں جہاں کہیں ان کا تذکرہ کرتے ہیں، پورے ایک صفحہ میں ان کے القاب و آداب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں:

ہزار بار بہ شویم دہن بہ مشک و گلاب　　ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

اس جامع کمالات ہستی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے　　یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں　　اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ　　اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی جاں نہیں

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی　　کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

کم تر اوہ غضبِ زلفِ سیہ فام، یہ کافر　　کیا خاک جئے کوئی شب ایسی، سحر ایسی (ص۲۳۲)

اسد الدولہ نواب محمد تقی خاں بہادر ترقی تخلص میر سوز کے شاگرد شعر اچھا کہتے تھے، مولانا نے لکھا ہے کہ ان کا خاندان شرافت اور وضعداری میں ہمیشہ نیک نام رہا ہے، لکھنؤ کی

زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا مگر ان لوگوں کی وضعداری نہیں بدلی، ترقی کے یہ دو شعر گل رعنا کے حاشیے میں آگئے ہیں:

ساکنانِ کعبہ نے کی بت پرستی اختیار　　وہ صنم نامِ خدا کیا ان دنوں جوبن پہ ہے

در و دیوار سے آتا ہے نظر جلوہ دوست　　آئینہ خانہ مرا گوشہ تنہائی ہے (ص۳۶۳)

مرزا غالب کے تذکرے کے حاشیے میں ایک جگہ مصنف گل رعنا نے نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور کی جو صاحبِ دیوان تھے ایک پوری غزل نقل کی ہے، میں مطلع کا شعر درج کرتا ہوں:

میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط　　کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط (ص۳۱۳)

مرزا مظہر جانِ جاناں کے تذکرہ میں میر عبدالحیٰ تاباں کا کسی موقع سے ذکر آیا ہے جن کو مرزا صاحب سے عقیدت اور مرزا صاحب کو ان سے محبت تھی مصنف گل رعنا نے ان پر طویل حاشیہ لکھا ہے جس میں ان کے یہ اشعار درج ہیں:

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں　　ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا

ہنستا ہے گل چمن میں تو نالاں ہے عندلیب　　دو دل خوشی نہ دیکھے کبھی اس جہاں کے بیچ

انجان ہو تو اس سے کوئی دردِ دل کہے　　جو جانتا ہو، میں اسے آگاہ کیا کروں

اے باغباں اب تو جاتے ہیں ہم قفس میں　　چھوٹے تو پھر ملیں گے گر بال و پر رہیں گے

جاتی ہے عمر ہر دم ہم کو خبر نہیں ہے　　کیا جانیے کہ کب تک ہم بے خبر رہیں گے (ص۱۳۰-۱۲۹)

سودا اور میر سوز کے ایک شاگرد نواب مہربان خاں رند دیوانِ فرخ آباد تھے، مرزا محمد رفیع سودا کے تذکرے میں ان کا کسی مناسبت سے نام آیا ہے، حاشیے میں ان پر جو نوٹ ہے اس میں یہ تین اشعار بھی درج ہیں:

خلقت تمام گردشِ افلاک سے بنی
ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

مجھ ساتھ تیری دوستی جب ہوگئی آخر
دنیا کی مرے دل سے طلب ہوگئی آخر

حاصل تو ہوا وصل ہمیں رات پر افسوس
اک پل میں شب عیش و طرب ہوگئی آخر
(ص ۱۶۱)

سید محمد شاکر ناجی کے تذکرہ میں عمدۃ الملک امیر خاں محمد شاہی کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ناجی ان کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے، امیر خاں کی طبیعت نہایت بذلہ سنج و لطیفہ گو واقع ہوئی تھی، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور انجام تخلص تھا، مصنف گل رعنا نے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت
شکر ہے تڑپے نہ زیر خنجر جلاد ہم

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو
سوزن تدبیر بھی گو سو برس سیتی رہے

نواب محمد یار خاں امیر نواب رام پور علی محمد خاں کے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے، شیخ قیام الدین قائم سے مشق سخن کی، اس مناسبت سے قائم کے تذکرے میں انکا نام آگیا ہے، جس کے حاشیے میں مصنف گل رعنا نے یہ تین شعر نقل کیا ہے ؎

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا
یا رب برا ہو، اس دلِ خانہ خراب کا

ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے
ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا

گر وقتِ ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا
پیالے کسی کا ہاتھ، کسی کی زباں چلے
(ص ۱۸۷)

شاہ نصیر کے استاد شاہ محمدی مائل کے یہ تین شعر بھی حاشیے میں درج ہیں:

حال کہنے کی نہ دی گریہ نے فرصت رات کو
آج پھر کہیو اسے مائل وہ کیا افسانہ تھا

کیا کہوں میں تجھ سے دلِ زار کی ہوس
مشہور ہے جہاں میں بیمار کی ہوس

کہتا نہ تھا کہ باز آ ہر دم کی اس ہنسی سے
آخر گیا نہ ظالم اک بے گناہ جی سے
(ص ۲۴۷)

شاہ نصیر ہی کے تذکرے کے ایک حاشیہ میں راجہ چندو لال دیوان کے یہ شعر نقل ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور شاداں تخلص تھا:

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

شاداں وہاں بھی کیا ہے حسینوں کی انجمن
جاتے ہیں لوگ کیوں عدم آباد کی طرف

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقتِ صبحِ صادق کو
اثر رکھتی ہے اکثر جو دعائے صبحِ صادق ہو
(ص ۲۶۹)

میر نظام الدین ممنون کے حال میں انکے والد میر قمر الدین منت کے حاشیے کے اردو اشعار ملاحظہ ہوں:

علاجِ دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے سے
یہاں کیا ہو گیا وہ معجزہ حضرت سلامت کا

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیالے
ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

قدم رکھ گیا کون سینے پہ اپنے
گل داغ میں آج مہندی کی بو ہے
(ص ۲۸۳)

اکبر الہ آبادی نے مولوی وحید الدین وحید رئیس کڑہ سے مشق سخن کی، ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے
(ص ۴۴۸)

میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کے دو شعر بھی ملاحظہ ہوں:

اے یاس تو نے داغِ تمنا مٹا دیے
گلزار تھا یہ دل اسے ویرانہ کر دیا

نہ کر کسی سے محبت یہ ہم نہ کہتے تھے
دلِ فریفتہ سنتا ہے تو بھلا کس کی (ص ۴۲۳)

(باقی)

سیرت نبویؐ پر ایک ہندو کی مراٹھی تصنیف

از جناب انیس احمد چشتی صاحب، پونا

یہ ایک عجیب بات ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ جب سلاطین دہلی نے اور بطور خاص محمد بن تغلق نے دولت آباد (موجودہ اورنگ آباد) کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور اس کے ہمراہ امیر خسرو جیسی جلیل القدر شخصیتیں اور پر گو شعراء اس علاقے میں تشریف لائے تو اس کا لازمی نتیجہ نکلا کہ شمال و جنوب میں تہذیبی مواخات کے ساتھ ساتھ لسانی اور سماجی لین دین بھی واقع ہوا۔

۱۷۰۷ء میں جب احمد نگر میں اورنگ زیب نے اپنی آخری سانس لی اور اورنگ آباد میں سپرد خاک ہوا تو ولی دکنی ان ہی لمحات میں دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنا اردو کلام سنا رہے تھے اور دہلی کے دربار اور اونچی حویلیوں میں جہاں فارسی کا راج اور عربی کا رواج تھا وہاں آہستہ آہستہ جنوبی ہند کی زبان ولی دکنی کی مٹھاس کو لیے دلوں میں گھر کر رہی تھی اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی شہرت کی صدائے بازگشت جب دکن میں سنائی دینے لگے تو یہاں کی عوام نے بے محابا اس زبان کو گلے لگایا اور قلی قطب شاہ دکنی کی شاعری میں انہیں یگانگت کی بو باس آنے لگی جس میں انہوں نے خسرو کی فارسی اصطلاحات اور خواص کے لہجے کی براہ راست آمیزش کی اور نتیجتاً وہ اردو زبان وجود میں آئی جو اس وقت بھی مہاراشٹر میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور آج بھی بمبئی میں وہی اردو صنعتی

پیمانے پر استعمال کی جارہی ہے۔ اردو چونکہ ہند آریائی زبان ہے اسکا لیے یقیناً اس کا دور سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش کے بعد کا ہے جس میں شورسینی پشاچ اور مہاراشٹری کی شکلیں قامت اختیار کر چکی تھیں۔ یعنی یہ مرحلہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان کا ہے۔ آج مہاراشٹر میں وضع قطع کے علاوہ مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ان کی اردو زبان کا مادر زاد پن بھی ہے۔ یہاں تک کہ مہاراشٹر کے دیہاتوں اور دور افتادہ علاقوں میں اکثر ہندو اردو کے لیے "مسلمانی" کا لفظ بولتے ہیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے اپنی دینی اور علمی ضروریات کے لیے مراٹھی کا استعمال حرام نہیں تو مکروہ ضرور سمجھا اور شاعری سے لے کر قرآن فہمی تک اور فقہ سے لے کر تاریخ و سیر کے مندرجات تک سب کے سب علوم اردو میں استعمال کرتے رہے اور اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے دہلی، لکھنؤ، لاہور اور حیدر آباد وغیرہ کے علماء، مفکرین، ادباء اور دانشوروں سے استفادہ کیا اور آج بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اردو اور مراٹھی کے مابین اس ذہنی، لسانی اور ثقافتی بُعد کے باوجود مہاراشٹر کے مسلمانوں اور یہاں کے مسلم حکمرانوں نے مراٹھی زبان کو مالا مال ضرور کیا اور اسے نئے الفاظ مہیا کیے لیکن وہ مراٹھی زبان کو مسلمان نہیں کر سکے۔

ایک اندازے کے مطابق مراٹھی زبان میں تقریباً ۲۵ تا ۲۸ فیصد الفاظ فارسی اور عربی کے مستعمل ہیں۔ مثلاً تعاقب، کارگردگی، لفافہ، وکیل، انار، قمیص، صاحب، غلام، غلام گیری، راہداری، پروانہ، منسوخ، دستور، مخمل، لایق، نالایق، خوشی، درجہ، زیج، خریف، بہار، برشگال[1]، کم توت، حکمت، حکیم، واقف کار، قاعدہ، مزدور، مطلع، ([illegible]) منصف، شاعر (शाहिर)، میت، مقدمہ، کفن، دفن، دروغ، خرافات

---

[1] वर्षाकाल کی فارسی مراٹھی میں من وعن مستعمل ہے۔

(रखेशापत)، ناظر، قانون، روزنامہ، پرسش، عدالت، لازم، تعلیم، کسرت، راستہ، راست بازی، خانہ فیل خانہ وغیرہ۔ مگر اس کے باوجود اس میں ابتک کوئی معتبر اسلامی لٹریچر وجود میں نہیں آسکا ہے۔ تاہم قرآن مجید کے تین ترجمے ہو چکے ہیں، پچھلے پندرہ برسوں میں جو اسلامی دعوتی مراٹھی لٹریچر وجود میں آیا ہے، ان میں سے اکثر چھوٹی بڑی کتابیں اور رسائل یا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہیں یا پھر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہیں، یہ مزید حیرت کی بات ہے کہ سیرت نبویؐ پر مراٹھی زبان میں صرف تین کتابیں ہیں اور ان میں سے دو غیر مسلم مصنفین کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ تیسری کتاب ابوسلیم محمد عبدالحئی کی حیات طیبہؐ کا ترجمہ (पावित्र जीवन) کے عنوان سے [illegible]ء میں شایع ہوا تھا۔ غیر مسلم مصنفین کی دو کتابوں میں سے "سانے گروجی" کی لکھی کتاب کا نام ہے "اسلامی سنسکرتی" یعنی اسلامی تہذیب۔ اس نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہ سیرت پر لکھی گئی ہے اور نہ ہی اس کا واحد مقصد بھی یہ ہے۔

جن غیر مسلموں نے اسلام پر لکھا ان میں اچاریہ ونوبا بھاوے، یدوناتھ تھتے، سانے گروجی، ایم وہی پردھان، دی جی گدرے اور شری پاد جوشی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے اسلام پر لکھا ان میں سے اکثر حمید دلوائی، تسلیمہ نسرین، ارون شوری اور سلمان رشدی کے کام کی چیزیں ہیں۔ ان میں دل کے پھپھولے پھوڑے گئے ہیں۔ مہاراشٹر کے اکثر بڑے شہروں کے کتب خانوں کی لمبی چوڑی فہرستیں اور کیٹلاگ کھنگالنے کے بعد سیرت پر کسی مراٹھی داں غیر مسلم کی جو قابل قدر کتاب ہاتھ لگی ہے اس کا نام ہے (मुहम्मद पैगंबर) اس کے مصنف کا نام ایم وہی پردھان ہے۔ کتاب کی ضخامت بشمول IMPRINT اوراق کے $\frac{۲۳ \times ۳۶}{۱۶}$ کے ۳۴۰ صفحات ہے۔

کتاب کے اولین صفحات IMPRINT PAGES پہ طابع ناشر اور مصنف کے تعلق سے اس طرح تحریر ہے: "راؤ صاحب راؤ بہادر دامودر سانولارام ین دے نے اپنے اندو پرکاش چھاپہ خانے نمبر ۳۸۰ گرگاؤں روڈ، بمبئی میں چھاپا اور راؤ صاحب ایم وہی پردھان نے پریل، سپاری باغ روڈ بمبئی سے شایع کیا۔ اگلے صفحے پر مصنف نے اپنی اس تصنیف کو خالص ہندو عقیدے کے مطابق "حضرت محمد پیغمبر" کے چرنوں میں نہایت عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس انتساب کے بعد مصنف کی جانب سے اس تحریر پر یکم جنوری ۱۹۲۹ء کی تاریخ پڑی ہے۔ ایم وہی پردھان جنجیرہ کے نواب کے ہاں دیوان کی حیثیت سے ملازم تھے[1]۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیرتؐ پر مراٹھی زبان میں یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ مصنف کوتاہ بینی، تعصب ذہنی، بہتان تراشی اور افترا پردازی کے امراض سے پاک اور بڑی حد تک اسلامی افکار و انقلابات کا معترف اور نسلاً برہمن ہونے کے باوجود سیرت نبویؐ کے تابناک پہلوؤں کا نقیب نظر آتا ہے۔

بعض جگہوں پر اس کے قلم نے دھوکا بھی کھایا ہے، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح کو وہ نعوذ باللہ (प्रेमविवाह) لکھ بیٹھا ہے جبکہ اس سیرت گراف میں اس کے قلم سے اس عمل کی تردید بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض اسلامی اصطلاحات و الفاظ اور خاص ناموں کے تلفظ میں وہ غلطی کا بھی مرتکب ہوا ہے، مثلاً زیدؓ کو وہ ([illegible]) طائف کو ([illegible])، حارث کو ([illegible])، حدیث کو ([illegible]) لکھ بیٹھا ہے جو کہ ظاہر ہے اس کے انگریزی ماخذ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انگریزی میں "ث" کے تلفظ کے لیے

---

[1] دستاویزات ضلع مہاڑ (کوکن)، کلکٹر کچہری۔

TH کا استعمال عام ہے۔ اسی طرح ایم دھی پردھان نے بعثت سے پہلے کے تمام تذکرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے واحد غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے جیسے تُو اور وہ۔ مراٹھی میں اس عمل کے لیے ([illegible]) کا لفظ بولتے ہیں۔

اس کے برعکس سیرتؐ کے ان پہلوؤں کی جو ہمیشہ ناقدین کا ہدف بنے رہے ہیں مصنف نے نہایت بے باکانہ طور پر مدافعت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ جیسے تعدد ازدواج، ہجرت، اسلام کا تلوار کے زور پر پھیلنا، اسلام میں عورت کا مقام، واقعۂ افک اور بت شکنی وغیرہ کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا گیا ہے اور ان حقائق کی پوری وکالت کی گئی ہے۔

سن ۶۰۸۱-۶۰۸۳ میں ریاست مہاراشٹر کی آٹھویں جماعت کی تاریخ کی درسی کتاب میں ہجرت کے لیے مراٹھی زبان میں (पलायन) یعنی فرار اور انگریزی میں ESCAPE کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ یہی لفظ پورے مہاراشٹر میں مسلمانوں کے خون خرابے کا باعث بنا تھا اور صرف مالیگاؤں شہر میں، نوجوان مسلمانوں کی لاشیں خون میں لت پت ہو گئی تھیں۔ ایم دھی پردھان نے ہجرت کے لیے مراٹھی میں نہایت محتاط طریقے پر ([illegible]) وطن کو خیرباد کہنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اس کتاب میں کل ۱۱ ابواب ہیں۔ پہلا باب عرب کے جغرافیہ، تہذیب، تمدن، عربی اخلاقیات اور مہمان نوازی سے شروع ہو کر آخری باب اسوۂ حسنہ پر ختم ہوتا ہے جس کے آخر میں مغرب کے نامور مستشرقین و مورخین مثلاً آرنلڈ، بوس ورتھ اسمتھ، اسٹینلی لین پول، لیونارڈ جے کورے، ڈاکٹر گستاؤ ویل اور ٹامس کارلائل وغیرہ کی اسلام اور حضور پاکؐ سے متعلق آرا اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالے کے مندرجات نقل کیے ہیں۔ یہ حوالے خود مصنف کی وسیع النظری اور عمیق مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔

مصنف کی تحریر میں ایک طرح کا جوش اور اُبال ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک منصوبہ بند طریقے سے کعبے کی پاسبانی کے لیے صنم خانے سے اٹھا ہے۔ اسلام کی مدافعت میں وہ نہ صرف یہ کہ کمربستہ ہے بلکہ ایک قابل وکیل کی طرح مخالفین پر نقد و جرح کے وار بھی کرتا ہے، مثلاً بت شکنی کے جواب میں وہ سیرت کے حوالوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ کس طرح سرور کائناتؐ کا انصاف عیسائی یہودی اور زرتشت مذاہب کے ماننے والوں کے لیے یکساں تھا اور کس طرح انہیں اسلامی مملکت میں مراعات حاصل تھیں جو بعد میں بھی جاری رہیں۔

اسلام پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ "قوت بازو اور تلوار کی جھنکار کے زور پر پھیلا اور اس کی بنیاد کسی مضبوط فلسفے یا اصول پر قائم نہیں ہے"۔ مصنف نے اس الزام کے دفاع میں ایک پورا باب سپرد قلم کیا ہے۔ ہندوؤں کو مخاطب کر کے وہ لکھتا ہے کہ:

"ہم یہ الزام محض لاعلمی اور اسلام سے متعلق عدم واقفیت کی بنا پر دہراتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اسلام کا اور حضورؐ کے مشن نیز آپ کے صبر و رضا اور عام معافی کے اعلان نامے کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے"۔

ہم صرف محمد پیغمبر: اسلام کا علمبردار سے زیادہ آپؐ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آپؐ کی سیرت سے متعلق ہمیں ذرہ برابر بھی علم نہیں ہے۔ ہماری درسی کتابیں اس کے متعلق خاموش ہیں۔ تاریخ کی درسی کتاب میں ایک آدھ صفحے میں مذہب اسلام اور پیغمبر صاحب کی ادھوری سیرت تحریر کر کے اس صفحے کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ اتنے مختصر وسائل کے ساتھ کسی مذہب کے جملہ اصول و نظریات اور اس کے اسرار جاننا بے حد مشکل ہے۔ اس نے جگہ جگہ مثالیں دی ہیں کہ ایک دوسرے سے نبرد آزما قبائل کو آپؐ نے کس طرح شیر و شکر کر دیا جبکہ معاملہ یہ تھا کہ مکہ اور طائف کے دو افراد کی کسی راستے پر مڈبھیڑ ہو جاتی تو انکا ایک دوسرے

لہولہان ہوئے بغیر جدا ہونا مشکل تھا۔

اپنی تصنیف کے بارہویں باب میں اس نے "عرب کا نسوانی سماج اور اس کی اصلاح" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اکثر غیر مسلموں کا یہ تصور ہے کہ مذہب اسلام میں عورت کو کوئی مقام و درجہ حاصل نہیں"۔ یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسکے برعکس حضرت پیغمبرؐ سے پہلے عورتوں کی حالت ناقابلِ بیان تھی جسے آپؐ نے سدھار کر ساری دنیا کو یہ بتادیا کہ عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ اس پہلو کو اچھی طرح سمجھ لینے کے لیے اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد عورت کی پوزیشن کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی عورتوں کو مردوں سے کم درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا رہا ہے۔ مشہور مورخ گبن کے مطابق قدیم زمانے میں سماجی قوانین ایسے وحشیانہ اور ظالمانہ تھے کہ ان کے تحت عورتوں کو مدت العمر اپنے شوہر یا آقا کی مکمل غلامی کا مقدس فریضہ انجام دینا پڑتا تھا۔ رومی قانون کے مطابق شوہر اپنی بیوی کا مختار کل ہوا کرتا تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنے باپ کی مکمل ملکیت ہوا کرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ اور اس کی دولت شوہر کے قبضے میں چلی جاتی تھی، جہاں اس کا استعمال ایک بے جان شئے کی طرح کیا جاتا تھا۔ شادی شدہ عورتوں کو بھی ایک زر خرید غلام کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک دور میں تو یہ رومی قانون اس قدر ظالمانہ شکل اختیار کرچکا تھا کہ کسی شوہر کو اپنی بیوی کی معمولی سی غلطی پر بھی اسے ہلاک کر دینے کا حق حاصل تھا۔ سارے یورپ نے جس طرح اصلاح کے رہبرانہ اصول روم اور یونان سے اخذ کیے ہیں اسی طرح سماجی قوانین بھی انہوں نے اسی سرزمین پر مرتب کیے ہیں۔ تاہم تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ اس دور میں عورت کا مقام تقریباً سارے یورپ میں ایک جیسا ہی تھا۔

پامپے (پامپیائی) شہر کی حالیہ کھدائی میں دریافت بڑی عمارتوں اور رئیسوں کی کوٹھیوں میں لگے فواروں اور پتلوں کو دیکھ کر شرم و حیا کے مارے تہذیب کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ بڑے بڑے دیوان خانوں کی دیواروں پر شرمناک اور فحش تصاویر نظر آتی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رومی ریاستوں میں خواتین کو گوشے اور پردے میں رکھ کر انہیں مردوں کے لیے محفوظ کردہ جگہوں پر جانے کی سخت ممانعت رہی ہوگی یا تو پھر مردان کی آزادی اور عصمت کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوں گے۔ ایم گستاؤلی بان کے مطابق قدیم رومی شہر میں بیوی پر شوہر کو مکمل ظالمانہ حقوق حاصل تھے۔ عورتوں کو کوئی سماجی حق حاصل نہیں تھا۔ شوہر کے علاوہ دوسرا کوئی اس کے برتاؤ سے متعلق رائے زنی نہیں کرسکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اسے قتل کرنے کے بھی جملہ حقوق شوہر کو حاصل تھے، روم میں ایک سے زائد بیویاں رکھنے کا عام رواج تھا۔ اس بات سے سب واقف ہیں کہ مارک انتونی کی دو بیویاں تھیں۔ باپ اگر پاگل ہو تب بھی لڑکی کا بیاہ اسکی اجازت کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کو بھی فروخت کرنے کا حق حاصل تھا۔ اگر ترقی یافتہ روم کا یہ حال تھا تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں عورت کا کیا حال رہا ہوگا۔

یونان میں بھی طبقۂ نسواں کا یہی حال تھا۔ اسپارٹا میں ضدی اور کمزور بچوں کی ماؤں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہوگئی اور ایک سے زیادہ شوہروں کی وبا عام ہوگئی۔ ایتھنز میں عورت ایک جنس بازار کی طرح خریدی جاسکتی تھی۔ اپنی وصیت میں مال و دولت کے علاوہ اپنی بیوی کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے اس کا بھی اعلانیہ بیان ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی چابکدستی سر چڑھ کر بولتی تھی لیکن دل کے

اتنے ہلکے تھے کہ وہ عورت کو بدشگونی کی علامت تصور کرتے تھے۔ ترقی کے اعلیٰ ترین مناصب طے کرنے والے یونان میں طوائفوں کے علاوہ کسی دوسری عورت کو عزت کا مقام حاصل نہ تھا، اس لیے تعلیم اور اصلاحات کی جملہ سرگرمیاں صرف طوائفوں میں ہی جاری تھیں۔ یوری پائیڈلس کے مطابق عورت صرف بدی کا منبع ہے کبھی نیکی کی ادائیگی کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ کمزور بلکہ نااہل بھی ہے۔ چوتھی صدی میں جب یورپ نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھ لیا تب یورپ ساری دنیا میں یونانی اور رومی اصلاحات کا نقیب بن گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں یہ تازہ اصلاحات ہوئیں انہوں نے ہر جگہ خواتین کے حقوق کی پامالی کی اور عورتوں کو زمین بوس کر دیا۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک سارے یورپ میں عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی

اس طویل جرح کے بعد فاضل مصنف خطۂ عرب میں بعثت سے پہلے کی عورتوں کی وہ تصویر کھینچتا ہے جس سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے محض مصنف کے بیان کردہ اسلامی اصلاحات کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

"اسلام نے عورتوں کی اس حالت پر خصوصی توجہ دی اور لوگوں کو بتا دیا کہ ہر ایک کی ترقی کا دارومدار اس کی اپنی پرہیزگاری پر منحصر ہے۔ مذہبی اور اخلاقی فرائض کی ادائیگی کے لیے دونوں کو اپنی نفسیاتی قوت کا یکساں استعمال کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں دونوں کے سماجی حقوق برابر برابر ہیں"

مصنف زندہ درگور کیے جانے کی رسم کے خلاف بطور حکم ابوداؤد کے حوالے سے ایک حدیث نقل کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "جس کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو وہ اسے دفن نہ کرے، اسے ذلیل نہ کرے اور لڑکے کو بیٹی پر ترجیح نہ دے۔ ایسا انسان یقیناً جنت کا حقدار ہے"۔
آگے چل کر وہ رقمطراز ہے کہ:

"اسلام میں تعلیم کے معاملے میں عورت مرد میں کوئی تفریق نہیں۔ دونوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے لڑکے اور لڑکی دونوں کو یکساں تعلیم کے مواقع میسر آنے لگے۔ صرف اتنا ہی نہیں خاوند اور بیوی کے درمیان علمی اونچ نیچ کی خلیج حائل نہیں رہی، اور دنیا میں دونوں کو یکساں حقوق ملنے لگے۔ اسلام نے پہلی مرتبہ باپ کی وراثت میں لڑکی کو حصہ دلوایا۔ دینی اور سماجی طور پر بھی عورت اور مرد کو یکساں حقوق حاصل ہیں جس طرح مرد کو اپنی شریک حیات کے انتخاب کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ بغیر عورت کی اجازت سے کیا ہوا نکاح کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا اور ایسی صورت میں وہ شوہر سے علٰحدگی اختیار کر سکتی ہے"۔

ایک غیر مسلم مورخ اور دانشور کی تصنیف سے لیے گئے یہ اقتباسات اس لیے پیش کیے جارہے ہیں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں آج کے سازشی ذہن کے پیدا کردہ نام نہاد مسائل کا یہ منہ توڑ جواب ہیں۔ مصنف کے اکثر ماخذ انگریزی ہونے کے باوجود اس نے بسم اللہ، اللہ اللہ، یا برہمن رام رام کا وطیرہ اختیار نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔ پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد قاری کے ذہن پر اسلام کی عظمت اور پیغمبر اسلام کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔ غزوات عام مستشرقین کی طرح اس کے یہاں جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ ہیں۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ خندق کے تذکرے کے دوران مصنف نے اسلوب میں بلند آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ جنگیں مسلمانوں پر مسلط کردہ ہیں نہ کہ تسلط حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے پر اس نے کوئی آنچ نہیں آنے دی ہے۔ آپ کے عفو و درگزر، سراپا رحمت اور جود و سخا کے واقعات کو دل کھول کر گنوایا گیا ہے۔ صحابہ کرام اور انصار و مہاجرین کے باہمی تعلقات کو حکایت لذیذ کی طرح دراز تر بیان کیا گیا ہے۔

امیرالہند نواب محمد علی خان والاجاہ

از

جناب عبیداللہ — ایم۔ اے (مدراس)

ہندوستان کو آزاد ہوئے لگ بھگ پچاس سال ہو رہے ہیں۔ انگریزی عہد کی تمام باجگذار ریاستیں انڈین یونین میں ضم کر دی گئیں، دیسی ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں کو جو مراعات حاصل تھے وہ بھی ختم کر دیے گئے، سابقہ ریاست مدراس اور موجود تملناڈو میں خاندان انوری یا خاندان والاجاہی کے موجودہ نواب محمد عبدالعلی خان عظیم جاہ کو حکومت ہند کی طرف سے پرنس آف ارکاٹ کے خطاب کے ساتھ وہی مراعات اور امتیازات بدستور جاری ہیں جو انگریزی عہد میں ان کے اسلاف کو حاصل تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب محمد عبدالعلی خاں عظیم الدولہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۱۹ء) کے درمیان ایک معاہدہ ۱۹ ربیع الاول ۱۲۱۶ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۸۰۱ء کو طے ہوا اور نواب صاحب کو گدی نشین کیا گیا۔ بارہ ہزار ہن ماہانہ کی صورت میں رقم مقرر کی (ریاست کی سالانہ آمدنی کچھ بھی ہو) کرناٹک کا سارا ملکی، مالی اور فوجی انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت ہوگیا۔

موجودہ نواب محمد عبدالعلی خان عظیم جاہ کا قصر (امیر محل) شہر چینئی (مدراس) مختلف مذہبی، ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے، صدر یا وزیر اعظم جمہوریہ ہند،

مرکزی حکومت کے وزرا، اعلیٰ فوجی افسر، بیرونی ممالک کے سفراء اور وفود جب کبھی شہر چینئی آتے ہیں تو 'امیر محل' میں پرنس آف ارکاٹ سے ضرور ملاقات کرتے ہیں۔

دکن اور میسور کی تاریخ پر بہت کچھ تفصیلی مواد طبع ہو چکا ہے، لیکن خاندان والاجاہی کے متعلق بہت کم تاریخی واقعات طبع ہوئے ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر محمد غوث سابق منتظم شعبہ مخطوطات (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) نے اپنے ایک مضمون بعنوان "ہندوستان کی ابتدائی فرانسیسی اور انگریزی کشمکش میں خاندان انوری کا حصہ" میں بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ ریاست خاندان والاجاہی (کرناٹک) کی تاریخ پر جہاں تک علم ہے ارباب تاریخ نے اب تک بہت کم توجہ کی ہے، جب تک اس ریاست کی تاریخ نہ مرتب ہو جائے اس وقت تک تاریخ ہند کا ایک اصلی باب تاریکی میں ہوگا۔

خاندان والاجاہی کی ہندوستان میں آمد

خاندان والاجاہی میں امیر الہند نواب محمد علی خاں والاجاہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، وہ ۴۶ سال تک کرناٹک کے ناظم بلکہ مطلق العنان رئیس اور حاکم رہے۔ اپنے اوصاف حمیدہ کے ساتھ علمی اور ادبی دلچسپی اور مذہبی رواداری کی وجہ سے یہ دور ممتاز تھا، محمد علی والاجاہ کے والد بزرگوار نواب محمد انورالدین خاں سراج الدولہ شہامت جنگ گوپاموی فاروقی نے خاندان انوری یا والاجاہی کی بنیاد ڈالی' والاجاہ کا تعلق اس مشہور فاروقی خانوادہ سے تھا جس کے مورث اعلیٰ شیخ سلیمان نے نویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ کابل فتح کیا تھا اور اپنی حکومت قائم کی، شیخ سلیمان کے پوتے سلطان شہاب الدین احمد المعروف فرخ شاہ نے کابل پر حکومت کر کے عادل کا لقب پایا، چنگیز خاں کے حملوں کی وجہ سے اس سلطنت کا خاتمہ ہوا، فرخ شاہ کے پوتے نے افراد خاندان کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا، یہ لوگ

ملتان، قنوج اور گوپا مئو میں پھیل گئے۔

محمد علی والاجاہ ۱۱۳۵ھ میں شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے، گویا اصلاً اس خاندان کا وطن ثانی دہلی تھا۔ والد نے بچے کا نام غلام انبیاء رکھا کہ اس سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ ان کی والدہ نے عقیدہ امامیہ اثنا عشریہ کے مطابق ان کا نام محمد علی رکھا۔ چار سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ قصبہ گوپا مئو پہنچے، بسم اللہ خوانی کی رسم انجام پائی۔

سلسلۂ نسب | محمد علی والاجاہ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ شجرہ ذیل میں دیا گیا ہے:

نواب محمد علی خاں والاجاہ بن نواب انورالدین خاں بن حاجی محمد انور بن مولوی محمد منور بن شاہ نعم اللہ بن مخدوم عبدالحیٰ بن مخدوم عبدالقادر القنوجی بن قاضی عبداللہ بن قاضی ابراہیم اصغر بن شیخ نعمۃ اللہ بن شیخ علاءالدین اصغر بن شیخ محمد بن شیخ علاءالدین اکبر بن قاضی فخرالدین اصغر بن قاضی شعیب بن شیخ محمد احمد بن شیخ یوسف بن سلطان شہاب الدین احمد المعروف بفرخ شاہ بن شیخ فخرالدین اکبر بن سلطان سلیمان بن شیخ مسعود بن عبداللہ الواعظ الاصغر بن شیخ ابوالفتح الواعظ الاکبر بن شیخ اسحاق بن شیخ ابراہیم اکبر بن شیخ ناصرالدین (حضرت امام حسنؓ کے نواسے) بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

تعلیم و تربیت | محمد علی والاجاہ چھ سال کی عمر کو پہونچے تو اپنی والدہ اور ایک رشتہ دار کے ساتھ بنگالہ کے راستہ اپنے والد نواب انورالدین خاں کی خدمت میں پہونچے۔ والاجاہ کو موقع ملا کہ والد بزرگوار کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کریں۔

آصف جاہ اول نے ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۴ء میں نواب انورالدین خاں کو کرناٹک

میں محمد سعید سعادت اللہ خاں ثانی کا نگران اور نائب مقرر کیا تھا، چند ہی ماہ بعد سعادت اللہ خاں ثانی کے قتل کے بعد نواب انورالدین خاں کرناٹک کے ناظم مقرر ہوئے۔ ارکاٹ کو اپنا مستقر بنایا، کرناٹک کے فوجی اور دیوانی نظم و نسق کے لیے جن افراد کو مقرر کیا تھا وہ زیادہ تر گوپا مئو کے رہنے والے تھے۔ چند عہدہ داروں کے نام یہ تھے: محمد نجیب خاں (انتظامی مشیر) مسیح الزماں خاں (بخشی گری) غضنفر علی خاں (رسالہ داری) محمد ابرار خاں (پیادہ فوج کی سرداری) سید علی خاں صفوی سید ناصر علی خاں۔ راجا بسنت رائے، رائے منولال وغیرہ۔ نواب انورالدین خاں نے کرناٹک کے مختلف علاقوں کی نگرانی اپنے لڑکوں کے سپرد کی۔ نطھر نگر (ترچنا پلی) کا علاقہ محمد علی والاجاہ کے سپرد تھا۔

والد کا احترام | محمد علی والاجاہ اپنے والد بزرگوار کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ بھی والاجاہ سے محبت رکھتے تھے، والد نے انہیں حقہ پینے سے منع کر دیا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد والاجاہ اس عہد پر قائم رہے۔ اپنے بچوں کو حقہ کشی سے منع کرتے تھے۔

والاجاہ نے ایک مہم سے کامیاب لوٹتے ہوئے نطھر نگر کے قلعہ کے باہر کیمپ میں قیام کیا تاکہ دوسرے روز صبح سویرے والد کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ باپ سے صبر نہ ہو سکا بیٹے کے دیدار کے شوق میں جوش محبت سے اپنے ہی ہاتھ سے ایک منظوم خط لکھ کر قلعہ کے باہر بیٹے کے پاس بھجوایا۔

گر بخبرم زود درائی چہ شود   مانند نسیم سحر آئی چہ شود
ہر چند کہ بوی گل ز گل آید پیش   ای گل تو ز بو پیشتر آئی چہ شود

والاجاہ سے دریافت کیا کہ شہر میں داخل ہونے کا وقت کیا ہے، پھر یہ شعر بھی لکھا

شہر ما فردا پر از شکر شود   شکر ارزان ارزان می شود

دوسرے روز والاجاہ قلعہ نظرنگر میں باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، قدموں پر سر رکھ دیا۔ والاجاہ نے دیکھا کہ والد بزرگوار نے پلنگ کے بغیر زمین پر بستر بچھا کر تکیہ لگا لیا ہے اور خیال کیا کہ پلنگ کسی کو مرحمت کیا ہوگا، اپنے خادم خاص کو اپنا پلنگ لانے کے لیے کہا۔ انورالدین خاں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور والاجاہ سے کہا "وہ خدا تعالیٰ سے عہد کیے تھے کہ جب تک تم فتح و کامرانی سے واپس نہ آجاؤ زمین پر ہی سویا کروں گا۔ اب جبکہ تم آگئے آج ہی سے پلنگ استعمال کروں گا"۔

ایک مرتبہ والاجاہ بیمار پڑ گئے، باپ ان کو دیکھنے کے لیے گئے اور پلنگ سے متصل بیٹھ گئے۔ اس وقت جو اطباء حاضر تھے ان میں حکیم علی اکبر، حکیم محمد امین اور حکیم سکندر بھی موجود تھے، اطباء نے کیفیت عرض کی اور نواب انورالدین خاں نے یہ شعر پڑھا:

جان من سہل است جان جانم اوست
درانداختہ ام در مانم اوست

۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء میں آمبور کے مقام پر فرانسیسیوں سے جنگ کرتے ہوئے انورالدین خاں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال تھی۔ لاش چند دن ارکاٹ کی جامع مسجد میں امانت رکھی گئی، اس کے بعد حیدرآباد لے جائی گئی، آصف نگر کے محلہ میں ان کے پیر و مرشد حضرت میران سید شاہ ولی اللہ محمد قادری کے مزار کے پائین میں دفن کیا گیا۔

نظامت | باپ کی شہادت کے بعد نواب محمد علی خاں والاجاہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں کرناٹک کے ناظم مقرر کیے گئے، مغل حکمران شاہ عالم بادشاہ نے نواب محمد علی کو امیرالہند والاجاہ کا خطاب، خلعت وغیرہ عطا فرمایا ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء کے معاہدہ الہ آباد

کی رو سے والاجاہ آصف جاہی خاندان کے تابع نہ رہے۔

محمد علی والاجاہ کے خصائل اور عادات | محمد علی والاجاہ کو قدرت نے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ سے نوازا تھا، زمانہ کی سیاست میں جو بلندی حاصل کی وہ ان اوصاف کا عکس تھی۔ توزک والاجاہی میں والاجاہ کے دن رات کی مصروفیت کا خاکہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

" والاجاہ رات میں تین بجے بیدار ہوجاتے، وضو کر کے تہجد کی نماز پڑھتے اس کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مصروف ہوجاتے، صبح کی نماز پڑھ کر آفتاب کے طلوع ہونے تک کسی سے بات کیے بغیر وظائف پڑھنے میں مشغول ہوجاتے۔ یہ درود چنے کے دانوں پر پڑھا جاتا تھا، قریب قریب دو سو افراد حاضر رہتے تھے، شاگرد پیشہ ور افراد اور اہل مذہب کی کوئی تمیز نہیں تھی، اس طریقہ درود خوانی کو والاجاہ نے ایک دائمی مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس کے بعد ایک مجلس مذاکرہ شروع ہوتی اس مجلس میں علماء فضلاء برادران و فرزندان احباب اور قرابتدار جمع ہوتے اس مجلس کے بعد دربار عام ہوتا، کاغذوں پر دستخط ہوتے، امور ریاست کی اصلاح کے بارے میں مشورے ہوتے، ظہر کی نماز کے بعد دارالانشاء میں مصروف رہتے، گھربار کے کاروبار، قرابتداروں کے حالات کا استفسار اور مساکین کے حالات کا جائزہ لیا جاتا، عصر کی نماز سے فارغ ہوکر علماء اہل تصوف اور مشائخ کے جلسہ میں شریک رہتے، گفتگو ہوتی، معاملات پر غور و خوض ہوتا، اہل مجلس کے ساتھ نماز مغرب اور عشاء ادا کی جاتی، اس کے بعد امور ملکی کا انتظام ہوتا، اس کے بعد خوابگاہ چلے جاتے، والاجاہ پابند نماز تھے، روزانہ پانچ وقت کی نماز

ادا کرنے کے علاوہ نماز جمعہ کے بھی پابند تھے، عیدین کی نمازیں بھی پڑھا کرتے
تھے۔ نفل نماز بھی ادا کرتے تھے، خاص خاص موقعوں پر دعائیں پڑھنے کے سلسلہ
کو بڑی کوشش سے جاری رکھا تھا، بعض مقدس راتوں میں شب زندہ داری کے
بھی عادی تھے، مسجد کو پیدل جایا کرتے، رمضان کے پورے روزے رکھا کرتے
نفل روزوں کے عادی تھے، گناہوں سے بچا کرتے تھے، لوگوں کی خطاؤں کو
معاف کر دیا کرتے۔ درود پڑھنے پر ہمیشہ مائل رہتے تھے۔"

والاجاہ کے علمی اور ادبی خدمات

والاجاہ کا دور حکومت علم و فضل کی قدردانی کے لحاظ سے
خاص اہمیت رکھتا ہے، اس دور میں علم و ادب کی خوب ترقی ہوئی، والاجاہ کے ادبی
ذوق، علم و فضل کی قدر دانی اور شعرا نوازی کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں
کے بڑے بڑے علماء، مشائخ طریقت، نامور شعرائے کرام اور اطبائے حاذق کے
علاوہ ایران و عرب کے اہل علم و قلم بھی ارکاٹ چینئی اور کرناٹک کے دوسرے علاقوں
میں جمع ہو گئے تھے، جیسے مولوی امین الدین خاں (المتوفی ۱۱۹۵ھ)، سید محمد والہ موسوی
(خراسان۔ المتوفی ۱۱۸۴ھ) قاضی تلمسانی (افریقہ۔ المتوفی ۱۲۰۱ھ) ....
.... مولوی سید شاہ عبد القادر مہربان فخری (المتوفی ۱۲۰۳ھ) مولانا
باقر آگاہ (المتوفی ۱۲۲۰ھ ملا عبد العلی محمد المتوفی ۱۲۲۵ھ) مولوی غلام محی الدین معجز (المتوفی
۱۲۳۹ھ) مولوی محمد غوث شرف الملک المتوفی ۱۲۳۸ھ) وغیرہ۔

والاجاہ کی علم دوستی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے مشہور شاعر
میر اسمٰعیل خاں ابجدی کو انور نامہ تحریر کرنے پر والاجاہ نے ابجدی کو چاندی میں تلوا کر
ہم وزن رقم اور خلعت مرحمت فرمایا تھا، میر اسمٰعیل خاں ابجدی، سید شاہ میر بیجاپوری کے

فرزند تھے، سید شاہ میر بیجاپوری جنوبی ہند کے مشہور مورخ ملا محمد قاسم مولف تاریخ فرشتہ
کے بہنوئی تھے، ابجدی کا خاندان بیجاپور کی تباہی کے بعد چینئی کے ایک تعلقہ چنگل پیٹ
میں مقیم ہوا۔

مذہبی خدمات

والاجاہ پابند مذہب تھے، اپنے دور حکومت میں کرناٹک کے مشہور
شہروں میں مساجد تعمیر کروائیں۔ شہر چینئی کے مشہور مساجد کے نام یہ ہیں۔ مسجد والاجاہی
مسجد معمور، مسجد سعید آباد، عیدگاہ وغیرہ جیسی شاندار مساجد والاجاہ کی زندہ یادگار
ہیں۔ کرناٹک کے دوسرے شہروں مثلاً ترچناپلی، ارکاٹ، ناگور وغیرہ میں والاجاہ کی
تعمیر کردہ مساجد اب بھی موجود ہیں۔

اپنے وطن گوپامئو (یو۔ پی) میں حسب ذیل چار یادگاریں موجود تھیں۔
مدرسہ والاجاہی، جامع مسجد گوپامئو کی جدید تعمیر، عیدگاہ اور قبہ مزار حضرت
مخدوم اعزالدین سرخ، اجمیر کا سماع خانہ بھی والاجاہ نے تعمیر کروایا تھا۔

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلی، مشہد شریف میں آب دار
خانے قائم کرکے ان کے مصارف ادا کرتے تھے، شریفوں اور صالحوں کی خدمت میں
نذریں بھیجتے اور اس ملک کی صنعتیں بھی بطور تحفہ روانہ کرتے۔ دو بحری جہاز خریدے
گئے تھے، ایک کا نام سفینۃ اللہ اور دوسرے کا نام سفینۃ الرسول تھا، حاجیوں کے
جدہ لانے اور لے جانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ حرمین شریفین میں سند فراشی
(جاروب کشی)، اور چراغوں کو روشن کرنے کی خدمت موروثی طور پر سلطان ترکی سے
حاصل کی تھیں۔ ان سب اخراجات کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی محمود بندر
کے محاصل سے بطور جاگیر مقرر کی تھی، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اپنے وکیل مقرر

کیے تھے، یہ وکیل نادار لوگوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ ان کے لیے طعام کا اہتمام کرتے تھے۔ غریب حاجی جن کے پاس رقم نہیں ہوتی تھی، ریاستی وکیل ادا کرتے تھے۔ اہلِ حرمین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں بھیجا کرتے تھے۔ ان سہولتوں کی وجہ سے عرب محمد علی والاجاہ کو 'سلطان الہند' کا لقب دیتے تھے، جمعہ کے خطبوں میں سلطان ترکی کا نام لینے کے بعد 'امیر الہند والاجاہ' کا نام لیا جاتا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حجاج کے قیام کے لیے 'رباط' بھی تعمیر کروائی تھی، اب بھی 'ارکاٹ رباط' کے نام سے مکہ معظمہ میں موجود ہے، جہاں ٹمل ناڈ ۔ است کے حجاج قیام کرتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء کے حج کے موقع پر راقم الحروف کو 'ارکاٹ رباط' میں قیام کا موقع ملا۔ ہر قسم کی سہولتیں اس رباط میں میسر ہیں۔ مدینہ منورہ کی رباط حاصل کرنے کے لیے نواب محمد عبد العلی خاں عظیم جاہ پرنس آف آرکاٹ نے حکومت سعودیہ سے تعلق رکھے ہیں۔

نواب والاجاہ کے دورِ حکومت میں مختلف صوفیائے کرام اسلام کا اخوت و مساوات والا پُر امن پیام ساتھ لے کر اپنے قول و فعل سے اس کی تشہیر ریاست کرناٹک کے مختلف علاقوں میں کرتے رہے، چند صوفیائے کرام کے نام ذیل میں دیے گئے ہیں۔

حضرت محمد مخدوم عبد الحق ساویؒ عرف دستگیر صاحب گیان بھنڈاری (المتوفی ۱۱۶۵ھ) (جنود میں گیان بھنڈاری کے نام سے مشہور تھے) حضرت شاہ ابو الحسن قربیؒ (المتوفی ۱۱۸۲ھ) حضرت سید شاہ عبد اللطیف ذوقی (المتوفی ۱۱۹۴ھ) حضرت خواجہ سید رحمت اللہ قادری نائب رسول اللہؒ (المتوفی ۱۱۹۵ھ) حضرت شاہ تراب چشتی (ترنامل)

محمد علی والاجاہ بھی شاہ ظاہر الدین محمد (المتوفی ۱۲۱۰ھ) کے مرید تھے، عبد الجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شاہ ظاہر الدین محمد پالکی میں بیٹھے ہوتے اور

والاجاہ آپ کے نعلین ہاتھ میں لیے پیدل چلتے تھے۔ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد دکن میں والاجاہ کی ایک مثنوی مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہے جس میں تصوف کے بعض مسائل منظوم کیے گئے ہیں۔ کتب خانہ مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب میں والاجاہ کی تالیف 'دعائے معظم' مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ مختلف دعاؤں پر مشتمل ہے، خاص خاص اوراد خاص خاص دنوں اور اوقات میں پڑھنے کے ہدایات بھی شامل ہیں۔

رواداری | والاجاہ کا دور مذہبی رواداری کے لحاظ سے بہت مشہور تھا، ہندو مسلم شیر و شکر تھے۔ راجا حکومت رام ریاست کے دیوان تھے، یہ صاحب ہنر تھے، انکے بہت سے قلمی فارسی خطوط اور دیگر شاہکار آج تک محفوظ ہیں، کاشی پرشاد فدوی کو رائے کا خطاب اور پیش کاری کی خدمت عطا ہوئی۔ مکھن لال منشی تھے اور رائے کا خطاب دیا گیا۔ مختلف مندروں کو جاگیریں دی گئیں۔

عدل و انصاف | والاجاہ نے پوری کوشش کی کہ عدل و انصاف کا خیال رکھا جائے اور اسلامی روایات کو برقرار رکھا جائے، ذیل میں ان کے عدل و انصاف کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔

محمد علی والاجاہ کے بڑے فرزند عمدۃ الامراء کمسن تھے کہ ایک دن کھیل کود کے موقع پر ان کے ہاتھ سے ایک معمار کے بچہ کی پیشانی پر ضرب لگی، خون بہنے لگا، اس وقت والاجاہ دار العدالت سے اٹھ کر محل سرا جا رہے تھے، زخمی بچہ کو روتا دیکھ کر واقعات دریافت کیے۔ اپنے بیٹے کے فعل کو خدا ترسی کے خلاف تصور کیا۔ اپنے بیٹے اور معمار کے بیٹے کو دار العدالت میں لے جانے کا حکم دیا۔ اپنے بیٹے کو مجرموں کے مقام پر کھڑا کیا، ارباب عدالت سے درخواست کی کہ تعدی کرنے والے کو سزا دی

جائے اور ولدیت کے رشتہ کو سزا کی اجرائی میں حارج نہ سمجھیں۔ حاکم عدالت وزارت علی خاں عرب تھے، موصوف نواب انور الدین خاں کے زمانہ سے اس خدمت پر مامور تھے، حاکم عدالت نے یہ نکتہ پیش کیا کہ دونوں غیر مکلف ہیں۔ شرعی حدود میں نہیں آتے، محمد علی والاجاہ نے کہا کہ اس مسئلہ کی شرعی نوعیت پر کوئی قیل وقال نہیں ہو سکتی، لیکن انتظام حکومت بھی تو ضروری ہے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ چنانچہ معمار کے بچہ کو حکم دیا گیا کہ عمدۃ الامراء کی پیشانی پر بھی اسی شدت سے ضرب لگائی جائے جس شدت سے اس کی پیشانی پر ضرب لگی تھی۔ معمار کے بچہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس واقعہ سے سب کارکنوں کے ذہن میں والاجاہ کے عدل و انصاف کا سکہ بیٹھ گیا اور رعب طاری ہو گیا۔

فلاحی کام | والاجاہ نے اپنے دور میں رعایا کے لیے دار الشفاء کا قیام، کنوؤں کی کھدائی، پلوں کی تعمیر، باغوں کی درستگی، نہریں جاری کرنا وغیرہ جیسے فلاحی کام انجام دیے۔

داد و دہش | محمد علی والاجاہ فیاض حکمراں تھے، بہت سارے مشائخ و اہل کمال وغیرہ کی مالی مدد کرتے تھے۔ مثلاً بریلی کے شاہ ابو سعید اور ان کے فرزند شاہ ابو اللیث ہندوستان کے باشندوں کی اولاد اور امراء وغیرہ بھی والاجاہ کے داد و دہش سے مستفید ہوئے۔ مرشد قلی خاں ناظم بنگالہ کے فرزند یحییٰ خاں، ناظم دکن مبارز خاں کے پوتے خواجہ مودود خاں، آصف الدولہ کے پوتے حمید الدولہ، محمد شاہ بادشاہ کے امیر خاص دلاور خاں وغیرہ گردشِ زمانہ کی وجہ سے تباہ حال ہو گئے تھے، والاجاہ کی مالی امداد سے ان کی مشکلات دور ہوئیں۔

تواضع اور کسر نفسی | محمد علی والاجاہ اپنی داد و دہش کے باوجود تواضع اور کسر نفسی میں مشہور تھے۔ کرناٹک سے گویا مئو تک غریبوں اور قرابتداروں کے لیے ان کا

دستر خوان ہمیشہ بچھا رہتا تھا، محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ نذر و نیاز کے موقع پر دعوتوں میں لوگوں کا اجتماع ہوتا یا کسی اور موقع پر مجلسوں میں مشائخ اور فقراء وغیرہ جمع ہوتے تھے تو ان کے ساتھ مدارات کی جاتی، مہمان نوازی کا جو اہتمام کرتے اس کی نظیر مشکل سے ملتی تھی، خود مہمانوں میں کھڑے رہتے، مہمانوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھلاتے تھے، اس کے باوجود والاجاہ کی بزرگی کا رعب ملازموں، مصاحبوں اور فرزندوں پر اس قدر چھایا رہتا کہ کوئی بات کرنے کی جرات نہیں کرتا۔

رحمدلی | نواب محمد علی والاجاہ میں رحمدلی اس درجہ تھی کہ انہوں نے کبھی کسی فرد کو تکلیف نہ دی۔ والاجاہ کی خوابگاہ کی چوکی پر جو لوگ پہرہ دیتے تھے ان میں سے کسی کو سوتا دیکھتے تو اپنا تکیہ اس کے سرہانے رکھا دیتے اور صبح تک اس کو اٹھانے کی ترکیب نہ کرتے۔ ایک مرتبہ ایک سفر کے موقع پر ایک فراش کو اپنے خیمہ میں اپنی مسند کے پاس سوتے ہوئے پایا۔ والاجاہ اس مسند پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری جگہ بیٹھ گئے اور ملاقات عام کا حکم دے دیا، لوگوں کو بھی منع کر دیا کہ فراش کو بیدار نہ کرے۔

والاجاہ کسی جانور کو مارنے سے بھی پرہیز کرتے، چنانچہ قربانی کے وقت چوپایہ پر اپنا ہاتھ پھیر دیتے تھے اور قربانی دوسرا شخص کر دیتا۔

اگر کسی بچھو اور سانپ پر نظر پڑ جاتی تو اس کے محافظ بن جاتے اور زندہ جنگل میں پہونچا دیتے۔

وفات | والاجاہ کا انتقال ۲۹ ربیع الاول ۱۲۱۰ھ روز سہ شنبہ سات ساعت صبح ہوا، ان کی مدتِ حکومت ۴۶ سال سات ماہ تیرہ [13] دن تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محمد علی والاجاہ کو مشہور صوفی حضرت مخدوم عبد الحق ساداتی القادریؒ کے مقبرہ میں امانتاً

سونپا گیا تھا، لیکن حضرت دستگیر صاحبؒ نے کسی سے عالم رویا میں کہا کہ "فقیروں میں بادشاہ کا کیا کام"۔ اس لیے والاجاہ کی نعش کو تدفین کے لیے نطہر نگمہ (ترچناپلی) لے جایا گیا۔ اس سفر میں جہاں جہاں قیام کیا جاتا تھا والاجاہی خاندان کی جانب سے اس مقام پر مسجد تعمیر کی جاتی تھی، یہ مساجد اب بھی تملناڈو اسٹیٹ میں والاجاہی خاندان کے دور حکومت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ حضرت نطہر علی طبل عالم بادشاہ کی درگاہ کے احاطہ میں نواب محمد علی والاجاہ کو دفن کیا گیا۔ "ستون خیرات شکست" تاریخ وفات ہے۔ اس زمانہ کے مشہور فارسی شاعر لکھن لال خرد نے یہ تاریخ لکھی۔

چو والاجاہ سنش پنج و ہفتاد — ازین دار فنا رفتہ بجنت
شدم در فکر لش بسکہ حیران — خرد گفتا بصد افسوس و حسرت
سن تاریخ دان در وقت رحلت — ہزار و دو صد و دہ بذ ہجرت

کتابیات

قصر والاجاہی از محمد حسین تمنائی، توزک والاجاہی از برہان خاں ہانڈی، بیاض از عبدالوہاب مدار الامرا، دیوان عظیم جاہ، خلاصہ سوانحات ممتاز از میر خورشید حسن، مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال، باقر آگاہ از ڈاکٹر ذاکرہ غوث، خاندانی روزنامچے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمات قرآن

از پروفیسر نثار احمد فاروقی۔ دہلی

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ ہمارے علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ ان کے علمی کارناموں کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو اسلامی ثقافت کے ہر ممتاز شعبے میں ان کی خدمات پوری آدھی صدی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے باضابطہ کوئی تفسیر تو نہیں لکھی مگر ان کی تصانیف میں جابجا قرآن کریم سے استشہاد کیا گیا ہے اور انھوں نے قرآنی مطالب کی تشریح میں نہایت احتیاط اور سلامت فکر کا اظہار کیا ہے، آیات قرآنیہ کی تشریح ایسے دل نشیں پیرائے میں کی ہے کہ ریب وشک کی گنجایش نہیں رہتی۔ اسلامی عقائد اور اعمال کو وہ قرآن اور احادیث کی روشنی ہی میں پیش کرتے ہیں مگر اس میں ان کا تاریخی شعور بھی ساتھ دیتا ہے، متکلمانہ انداز بھی۔ تفسیر میں ان کی سلامت روی کا اسلوب یہ ہے کہ وہ لفظ قرآن کو سب سے پہلے قرآن ہی سے پرکھتے ہیں۔ مثلاً ایک ترکیب قرآن میں خاتم النبیین آئی ہے۔ یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کے خاتم ہیں۔ جس فرقے نے سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے سے انکار کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ کسی نبی کا مبعوث ہونا اب بھی ممکن ہے وہ خاتم کو اسم آلہ کہتا ہے یعنی ما یختتم بہ، یہ مہر کے مفہوم میں ہے جو تصدیق کے لیے لگائی جاتی ہے۔ علمائے اہل سنت بلکہ جمہور علما کا کہنا یہ ہے کہ مہر تصدیق کے لیے یہ درست ہے مگر اسی میں عبارت کا تمام ہو جانا بھی شامل ہے، مہر تصدیق کے بعد جو عبارت اضافہ کی جائے گی وہ

غیر مصدوق وغیر مصدق ہوگی۔ تشریح تو یہ بھی درست ہے مگر کافی نہیں، اس میں تفریعات کی گنجائش رہ جاتی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے اصول تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن کی روشنی میں یہ دیکھا کہ مادہ ختم اور اس کے مشتقات قرآن کریم میں کن معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (۲:۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، یعنی نصیحت و ارشاد و ہدایت ان کے قلوب میں راہ نہیں پا سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مقصود یہ ہو کہ باہر سے کوئی شئے اندر داخل نہ ہو سکے تو یہاں ختم استعمال ہوگا۔ دوسرے موقع پر قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ (۸۳: ۲۶) یعنی شراب طہور جن ظروف میں ہوگی انہیں مشک سے مہر بند کیا ہوا ہوگا۔ مہر بند کرنے کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ نہ باہر سے کوئی شئے اندر داخل ہو سکے، نہ اندرون ظرف جو کچھ ہے وہ باہر نکل سکے۔ اس سے واضح ہوا کہ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ انبیائے سلف کا جو طویل سلسلہ ہے ان میں سے کسی نبی کو خارج نہیں کیا جا سکتا، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں نبی کو ہم نہیں مانیں گے یا وہ نبی نہیں تھے۔ اسی طرح اب کسی شخص کے دعوائے نبوت کو بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے واضح ہوگیا کہ خاتم النبیین کا مفہوم محض تصدیق انبیاء نہیں بلکہ سلسلۂ نبوت کا تمام ہو جانا ہی قرآن کی مراد ہے۔

اس ایک ہی مثال سے اندازہ ہوگا کہ سید صاحب کا اسلوب تفسیر سلامت فکر کا آئینہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کرتے ہوئے عام طور سے مترجمین نے لفظ رحمٰن کو اسم صفت قرار دیا ہے، لیکن قرآن کریم میں جن مواقع پر لفظ رحمٰن استعمال ہوا ہے ان میں غور کرنے سے معلوم

ہوگا کہ یہ اسم صفت نہیں اسم ذات ہے یعنی اللہ وہی ہے جسے تم رحمٰن کہتے ہو اور وہ نہایت رحم کرنے والا ہے بلکہ رحیم کا مفہوم از روئے قواعد عربی یہ ہوگا کہ ہمیشہ رحم کرنے والا ہے، اس لیے کہ فاعل جب بروزن فعیل آتا ہے تو اس کے فعل میں مداومت ہوتی ہے۔

علامہ سید سلیمان نے اپنے ابتدائی زمانے سے ہی قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کا ذوق پیدا کر لیا تھا۔ قرآنیات سے متعلق ان کے ابتدائی مضامین جیسے قضا و قدر[1] اور قرآن مجید (جولائی ۱۹۰۶ء) القرآن والفلسفۃ الجدیدۃ (۱۹۰۶ء) مسئلہ ارتقاء اور قرآن (دسمبر ۱۹۰۷ء)[2] مکررات القرآن (۱۹۰۹ء)[3] قیامت: قرآن کی روشنی میں" (اکتوبر ۱۹۰۹ء)[4] اسماء القرآن (اگست ۱۹۱۱ء) رسالہ الندوہ (لکھنؤ) میں شایع ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال سے وابستگی کے زمانے میں انہوں نے سیاسی اور ثقافتی موضوعات کے علاوہ کم سے کم دو مضامین قرآنیات پر بھی لکھے۔ ایک کا عنوان تھا: قصص بنی اسرائیل یہ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۱۳ء کے الہلال میں تین قسطوں میں شایع ہوا دوسرا مضمون علوم القرآن ۱۹۱۴ء الہلال ہی میں تین قسطوں میں چھپا تھا۔

"قصص بنی اسرائیل" کے بارے میں اس وقت صرف یہی کہنا ہے کہ اسرائیلیات علم تفسیر قرآن کا ایک قدیم شعبہ ہے۔ تفاسیر میں اسرائیلی روایات وہب بن منبہ، کعب الاحبار، عبداللہ بن سلام اور القرظی جیسے راویوں کے توسط سے آئی ہیں جن کے

---

[1] معارف: یہ مضمون علامہ شبلی کا ہے اور مقالات شبلی جلد اول (۶۵-۴۶) میں شامل ہے اور بعد والا مضمون القرآن والفلسفۃ الجدیدہ کے نام سے جولائی (۱۹۰۶ء) کے الندوہ میں شایع ہوا ہے [2] یہ دونوں غلطیاں یادگار سلیمان مرتبہ عبدالقوی دسنوی (ص ۱۳۵ و ۱۳۶) میں بھی ہیں [3] جنوری ۱۹۰۹ء آگے بھی شہور و سنین کی اسی طرح کی غلطیاں ہیں جن کی تصحیح کر دی گئی ہے [4] الندوہ جنوری ۱۹۰۹ء [5] ستمبر ۱۹۰۹ء۔

بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ یہودی ماخذ سے واقفیت رکھتے تھے لیکن اس صدی کی تیسری دہائی میں میکنزی نے یہودی ماخذ کی مدد سے قصص بنی اسرائیل کو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے اس میں ان قدیم مصادر کی روایات کی اصل شکلیں معلوم کی جاسکتی ہیں اور ہماری قصص الانبیاء کی کتابوں سے ان کا تقابلی مطالعہ بہت دلچسپ نتائج سامنے لاتا ہے۔

رسالہ معارف کی ادارت کے زمانے میں بھی علامہ ندوی مرحوم نے قرآنیات پر متعدد مضامین لکھے ہیں، کسی نے آزر اور مریم بنت عمران پر تاریخی اعتبار سے اعتراضات کیے۔ سید صاحب نے "قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات" کے عنوان سے جولائی[1] ۱۹۱۶ء کے معارف میں لفظ آزر پر بحث کی اور ستمبر ۱۹۱۶ء میں مریم بنت عمران کی تاریخی حیثیت پر محاکمہ کیا۔

" جنت سبا اور قرآن مجید کے ثبوت اعجاز کی کچھ قدیم شہادتیں" جنوری ۱۹۱۷ء کے معارف میں شائع ہوا، ان کے علاوہ: تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" (معارف اکتوبر ۱۹۲۹ء) تفصیل البیان فی مقاصد القرآن (نومبر ۱۹۳۲ء) ترجمان القرآن (اکتوبر ۱۹۳۲ء[2]) صبر کا قرآنی مفہوم (مئی جون ۱۹۳۵ء) شیخ جوہری الطنطاوی کی تفسیر جواہر القرآن کے مقدمہ پر تبصرہ (فروری ۱۹۳۷ء[3]) قرآن پاک کا تاریخی اعجاز (فروری ۱۹۳۹ء) کیا قرآن رسول کا کلام اور انسانی تعلیمات سے ماخوذ ہے؟ (اکتوبر ۱۹۴۰ء) وحی از روئے قرآن اور عمی کا تضاد بیان (نومبر ۱۹۴۰ء) اور ایک آیت کا زمانہ نزول (جون[4] ۱۹۴۴ء) یہ سب مضامین معارف کی زینت بنے۔ ان کے علاوہ بھی قرآنیات پر سید مرحوم کے

[1] جولائی کے بجائے اگست ۱۹۱۶ء میں [2] معارف: یہ اور اس سے پہلے کے دونوں مضامین تفسیر اور علوم قرآنی کی تصنیفات پر تبصرے ہیں [3] فروری ۱۹۳۷ء کے بجائے فروری ۱۹۳۸ء میں۔ [4] جون کے بجائے مئی ۱۹۴۴ء میں۔

مضامین معارف اور دوسرے رسالوں میں چھپے ہیں[1]، جن کا احاطہ سر دست مقصود نہیں۔

قرآنی آیات و الفاظ کی حکیمانہ تشریح کے نمونے ان کی تصانیف میں جا بجا موجود ہیں، بلکہ ان کی اساس ہی قرآن و حدیث پر رکھی گئی ہے۔ علامہ ندوی کو جو صفت دوسرے علمائے اسلامیات سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا گہرا تاریخی شعور ہے۔ اس کا ایک اچھا نمونہ تاریخ ارض القرآن ہے جو ان کی ابتدائی تصانیف میں سے ایک ہے اور اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی عالمانہ و محققانہ تصنیف تھی۔

مسلمانوں کو ابتدائی دور میں قرآن و حدیث، سیر و مغازی اور فقہ نے اتنا مصروف و منہمک رکھا کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے تاریخی آثار کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے پھر علوم کے مرکز بدل گئے اور بحث و تحقیق کے نئے موضوعات کا دروازہ یونانی علوم نے کھول دیا حالانکہ دنیا کے سارے مذاہب میں تاریخ کا سب سے گہرا واضح اور موثر شعور مسلمانوں ہی کا ملتا ہے اور تیسری صدی ہجری کے آتے آتے انہوں نے بہترین سائنسی اور منطقی اصول پر ہی کتب تاریخ و کتب رجال مدون کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس عہد میں اور اسکے بعد بھی کئی صدیوں تک کتب اور روایات ہی کو تاریخ کے مصادر سمجھا گیا۔ آثار کا تحفظ تو ہوا مگر ان کی تاریخی قدر و قیمت کا چنداں احساس نہ تھا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ آرکائیوز شخصی سطح پر بھی موجود تھے مگر آرکیالوجی کے تاریخی مصادر ہونے پر زیادہ توجہ ابتدائی صدیوں میں نہ تھی۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ قبل اسلام کے آثار کو کفر و شرک کی نشانیاں سمجھا جاتا ہو۔

مغربی علماء نے تاریخی مصادر میں ایک نئے شعبے کا اضافہ کیا جسے حفریات یا (EXCA-VATIONS) کہا جاتا ہے اور اس میں تیزی ۱۹۲۰ء کے بعد آئی ہے جب تاریخ ارض القرآن

[1] جن کا ایک مجموعہ دار المصنفین نے مقالات سلیمان جلد سوم کے نام سے شائع کیا ہے۔

لکھی جا چکی تھی۔ سرجان مارشل نے ارض فلسطین کو جس میں موجودہ اسرائیل، اردن اور شام کے علاقے بھی شامل ہیں خاص طور پر منتخب کیا جسے وہ بائبل کی سرزمین کہتے ہیں۔ یہاں حفریات EXCAVATIONS کے نتیجے میں طرح طرح کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا مطالعہ آج تک جاری ہے۔ ان آثار سے اب تک تو قرآن کریم کے ہر اشارے کی تفسیر اور ہر بیان کی تصدیق ہی حاصل ہوئی ہے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ ان حفریات کے نتائج کی روشنی میں اگر تاریخ ارض القرآن کا نیا ایڈیشن مرتب کیا جائے تو اس کی اہمیت و افادیت کئی گناہ بڑھ جائے گی۔ ابھی پچھلے سال ہی الربع الخالی کے اس حصے میں جو حجاز کے مشرق میں اور عمان سے ملا ہوا ہے ایک نئی دریافت ہوئی ہے جس کے بارے میں بہت وثوق سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جسے قرآن کریم میں ارم ذات العماد کہا گیا ہے۔ اس طرح کی اور بھی متعدد تحقیقات ہیں جنکی روشنی میں اس نہایت مفید کتاب کو UPDATE کیا جانا چاہیے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی حیات اور علمی خدمات پر چند کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ پی ایچ ڈی کے کم سے کم دو مقالوں کا مجھے علم ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے، پاکستان کا حال معلوم نہیں۔ ہندوستان میں علامہ ندوی کے بارے میں چند اچھے اور بڑے سمینار بھی ہوئے۔ علی گڑھ، پٹنہ اور بھوپال کے سمیناروں میں تو راقم الحروف بھی شریک تھا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ حضرت علامہ کی شخصیت اور علمی خدمات کے مختلف اور متنوع پہلوؤں پر مضامین و مقالات لکھے اور پڑھے گئے، مگر انکی قرآنی خدمات اور اسلوب تفسیر پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ اس موضوع پر ان کے فرزند رشید ڈاکٹر سید سلمان ندوی حفظہ اللہ کا ایک مضمون کہیں پڑھا تھا جس میں بہت مفید اشارے تھے۔ یہ موضوع بہت اہم ہے اور خاصی تفصیل کا تقاضا کرتا ہے، میں نے فی الوقت اس کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے مختصر نویسی سے ہی کام لیا ہے۔

اخبار علمیہ

ہندوستان میں فارسی زبان و تہذیب و ثقافت کی اشاعت و فروغ میں ایرانی سفارت خانہ کا شعبہ ثقافت لائق ستائش ہے، وقتاً فوقتاً وہ مختلف موضوعات پر سمیناروں کے انعقاد کے علاوہ مفید اور بلند پایہ کتابیں شایع کرتا رہتا ہے، اردو اور انگریزی میں متعدد رسائل کی اشاعت بھی پابندی سے ہوتی رہتی ہے، فارسی زبان میں "قند پارسی" کے نام سے شایع ہونے والا علمی و تحقیقی مجلہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، طباعت کے تمام محاسن سے آراستہ یہ مجلہ ہندوستان کے فارسی داں طبقہ کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب ہوا ہے، حال ہی میں اس کا ضخیم شمارہ (مارچ ۱۹۹۷ء) حافظ نمبر کی شکل میں موصول ہوا، اس میں خواجہ شعر و معرفت حافظ شیرازی اور ہندوستان میں ان کی پذیرائی و اثر انگیزی کے متعلق عمدہ مقالات و مضامین آ گئے ہیں، ان میں اکثر وہ مقالے ہیں جو ۱۹۹۴ء میں بمبئی میں منعقدہ حافظ شیرازی بین الاقوامی سمینار میں پیش کیے گئے تھے، متعدد مضامین میں ہندوستان میں موجود دیوان حافظ کے نسخوں کا جائزہ لیا گیا ہے، علامہ اقبال کے تعلق سے بھی کئی مضامین ہیں، ایک تحریر قاضی نذر الاسلام اور حافظ کے عنوان سے ہے، البتہ تعجب ہے کہ علامہ شبلی کے تعلق سے کوئی تحریر نہیں ہے جنھوں نے لکھا تھا کہ "یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہو سکا" یہ بھی امر مسلم ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا تنقیدی جائزہ پہلی بار ہندوستان میں علامہ شبلی کے

قلم ہی کا مرہون منت ہے، ایک گوشہ پروفیسر نذیر احمد کے پانچ مقالات کے لیے خاص ہے، پروفیسر شریف حسین قاسمی کی ادارت میں یہ خاص شمارہ خواجہ صاحب کے قدردانوں کیلئے بہترین تحفہ ہے۔

حافظ کا کلام گو صدیوں سے قدردانوں کے حافظہ میں زندہ و تازہ ہے لیکن اب سوء حفظ کی شکایت عام ہے، حال ہی میں ہندوستانی سائنسدانوں نے قوت حافظہ کو اور تیز کرنے کے لیے 'میموری پلس' نامی دوا ایجاد کی ہے، سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ایس کے باسو نے کہا کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس دوا میں بیکو سائڈ اے اور بی کے اجزاء سے حافظہ کو تقویت ملتی ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک مشکل یہی ہے کہ خود دوا کھانا کیسے یاد رہے، چنانچہ ہانگ کانگ کی ایک دوا ساز کمپنی ونسنٹ ریا نے ایک MEDIMATE بنائی ہے، اس میں مختلف گولیوں کے لیے خاصے بڑے خانے موجود ہیں، جن میں رنگ اور خوراک کے لحاظ سے جدا جدا ان گولیوں کو رکھا جا سکتا ہے، ان خانوں پر الارم کا نظام ہے جو خود بخود اپنی آواز سے یہ یاد دلاتا ہے کہ کس دوا کا کونسا وقت ہے اور وہ کتنی مقدار میں لی جا سکتی ہے، شاعرانہ انداز میں اس سائنسی عمل کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ ع بھول جانا ہمارا یاد رہے

حافظہ اور ذہن کے متعلق ایک تازہ تحقیق یہ بھی ہے کہ سرعت فکر کا تعلق ارادہ سے اس طرح ہے کہ کچھوے جیسے سست رفتار بطئ الفہم بھی خود کو سریع الفکر بنا سکتے ہیں، اس موضوع پر ہالینڈ میں داد تحقیق دی گئی اور اس سوال پر توجہ مرکوز کی گئی کہ اگر ایک شخص اپنی انگشت شہادت کو تحریک دینا چاہے تو اس خواہش اور اس کی بجا آوری میں کتنا وقت درکار ہے؟ محققین کے مطابق یہ خیال ذہن کے ایک گوشہ سے شروع ہوتا ہے اور ۶ سینٹی میٹر کے فاصلہ پر ایک دوسرے گوشہ تک انگشت نمائی کے عمل سے پہلے اپنا سفر مکمل کر لیتا ہے، اس کی یہ مدت مسافت ۰۰۹ ملی سکنڈ کی ہوتی ہے یعنی صفر اعشاریہ دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی بہت کم۔ پروفیسر البرٹ جیڈ نے یہ بھی بتایا کہ بیرونی محرکات کے نتیجہ میں رد عمل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا اثر عمل اضطراری کی شکل میں سامنے آتا ہے اس عمل کے مقابلہ میں فکر کو مہمیز کرنے میں خود ساختہ محرکات زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں، اس ذہنی ورزش میں مصروف ایک محقق جانسن کا خیال ہے کہ دماغ کے مرکز میں فکر کا یہ گوشہ جہاں حرکت کا خیال پنپتا ہے، پہلی بار متعین ہوا ہے، ان کے خیال میں یہ انکشاف اب اس علم کی نئی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔

سائنس کی دنیا میں گذشتہ سال کے نصف آخر کی سب سے اہم خبر یہ تھی کہ مریخ پر انسانی زندگی کے ابتدائی آثار و شواہد کی معرفت میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہے، یہ تحقیق دراصل انسان کی اس تلاش و جستجو کا ایک حصہ ہے کہ کیا ہم اس کائنات میں تنہا ہیں؟ قدرتاً اس انکشاف سے ساری دنیا پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہوگئی کہ مریخ پر قدیم ترین ایک خلیاتی زندگی کا ثبوت فراہم ہو گیا ہے، تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۸۴ء میں براعظم انٹارٹیکا میں شہاب ثاقب کا ایک حصہ دریافت ہوا، ہوسٹن امریکہ کے جانسن خلائی مرکز میں الکٹرونی خوردبینوں سے اس کے طویل تجزیہ کے بعد سائنسداں اس نتیجہ پر پہونچے کہ تیرہ ہزار سال پہلے زمین پر گرنے والا یہ حجر شہابی دراصل لاکھوں سال پہلے مریخ کے ایک آتش فشانی لاوا کے ابل پڑنے کا نتیجہ ہے جو بعد میں بتدریج سرد ہوگیا، یہ حجر شہابی بتدریج کم درجہ حرارت میں متغیر ہوا اور یہ تغیر جسم نامی کی ہیئت اجتماعی کے سرگرم ہونے سے ممکن ہوا اور یہی امکان زندگی کی موجودگی کا بھی پیام ہے، علاوہ بریں اس شہاب ثاقب میں

ایسے باریک ترین عناصر بھی پائے گئے جو مریخ پر اربوں سال پہلے زندگی کے ابتدائی شواہد قرار دیے جاسکتے ہیں لیکن اس تحقیق و انکشاف کو حکمائے چین نے محض ایک افسانہ قرار دیکر اس کی سنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ وائیجر اور گلیلیو جیسے تحقیقاتی سیارچوں سے جو کام بن نہ پڑا وہ دور افتادہ ایک پتھر کے ٹکڑے سے کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ ان کے اعتراض کا جواب اگرچہ دیا گیا ہے تاہم سیاست کی طرح سائنس میں دانش فرنگ اور حکمت چین کی کشمکش کو نیا میدان ضرور مل گیا۔

مریخ پر زندگی کے آثار کی دریافت نے بہرحال اتنا تو کیا کہ کائنات میں زندگی کے سراغ کو پانے کی خواہش تیز تر ہوگئی، حال ہی میں کیلی فورنیا میں یوروپا اوشن کانفرنس منعقد ہوئی اس میں سرگردانی افلاک کے ایک سائنسداں فرینک ڈریک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مشتری کے ایک چاند یوروپا میں بھی زندگی کے امکانات ہیں ان کے خیال کی بنیاد یہ ہے کہ اس نظام شمسی میں زمین کے علاوہ یوروپا ہی ایسا کرہ ہے جس کی کیمیائی ترکیب و ساخت میں پانی کے وافر اجزا شامل ہیں اور پانی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اس کانفرنس کے بعض شرکا نے دعویٰ کیا کہ مشتری کے اس چاند میں قریب ۹۵ کیلومیٹر گہرا سمندر ہے، اس کی تائید میں انہوں نے آسمانی تحقیقاتی سیارچوں وائیجر اور گلیلیو کی بھیجی ہوئی چند تصویریں پیش کیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی سطح پر برف کی ایک اور منجمد سطح ہے، بعض شرکا کا خیال تھا کہ یوروپا چاند میں زمین سے زیادہ پانی ہے، اس پانی کی تہہ میں آتش فشاں بھی ہیں جن سے وہ حرارت بھی ملتی ہے جو زندگی کے لیے ایک ناگزیر شئے ہے اور جو جراثیم کے نمو کا سبب بنتی ہے، اب ان خیالات کے بعد انتظار ہے گلیلیو تحقیقاتی سیارچہ کے اس نئے سفر کا جو خاص اسی چاند کی دید کے لیے ہے۔

ع۔ص۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

دائرہ معارف اسلامیہ لاہور

مخدومی و مکرمی اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ معارف برابر پہنچ رہا ہے، بہت بہت شکریہ آپ کی توجہ اور قدر افزائی سے معارف (فروری ۱۹۹۷ء) میں امام ذہبی کی جلیل القدر تصنیف سیر النبلاء پر میرا مضمون شایع ہوا ہے لیکن اس میں کتابت کی چند غلطیاں راہ پا گئی ہیں، جن کی تصحیح حسب ذیل ہے:

ص ۱۳۳۔ امام ذہبی کی صحیح تاریخ وفات ۷۴۸ھ/ ۱۳۷۴ء ہے۔

ص ۱۳۵۔ سطر ۹، تئیسویں [23] جلد کے بجائے تیسری جلد چھپ گیا ہے۔

ص ۱۳۶۔ سطر ۱۰-۹، امام ابن تیمیہ پر نقد و تبصرہ کے لیے دیکھئے (سیر النبلاء مقدمہ ص ۱۳۴، بحوالہ بیان زغل العلم ص ۱۷-۱۸)

ص ۱۳۶۔ سطر ۱، [1] محدث عصر کا صحیح نام استاد شعیب الارنؤوط ہے۔ برائے مہربانی ان تصحیحات کو معارف کی کسی قریبی اشاعت میں شایع کردیں۔ اسی سلسلہ کی اور دو کتابیں چھپ رہی ہیں، ملاحظہ کے لیے جلد بھیجوں گا۔

حضرت علی میاں مدظلہ کی خدمت عالی میں اگر اس دور افتادہ کا سلام پہنچا سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں دو تین خط اور دو کتابیں ان کو بھیج چکا ہوں لیکن ان کی طرف سے کوئی رسید نہیں آئی۔ شاید وہ باہر سفر میں ہوں، رفقائے کرام سلام قبول فرمائیں

امید ہے کہ آپ حضرات سے ہوں گے، توجہ فرمائی کے لیے مکرر شکر گزار ہوں۔ فقط والسلام

نیاز مند: الشیخ نذیر حسین

---

[1] معارف: یہ اور دوسری غلطی کتابت کی ہے مگر پہلی اور تیسری غلطی یا کمی خود شیخ صاحب کے مسودہ میں رہ گئی تھی۔

باب التقریظ و الانتقاد

سید سلیمان ندوی۔ حیات اور ادبی کارنامے

از جناب سبط محمد نقوی صاحب، لکھنؤ

سلسلہ کے لیے دیکھئے ماہ فروری ۱۹۹۷ء

اب ہم سید صاحب کی ولادت کے زمانے کے تعین کے بارے میں فاضل محقق کے رویے پر روشنی ڈالنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

یہ اشارہ تو ہم بار بار کر چکے ہیں کہ فاضل محقق نے کہیں بھی شان تحقیق کو راہ نہیں دی ہے۔ جہاں پیش رو حضرات سے اتفاق تھا وہاں تقلید فرمائی ہے۔ جہاں اتفاق نہ تھا وہاں خطائے اجتہادی کے باکمال سینہ زوری مرتکب ہوئے ہیں۔ اجتہاد واقعی اور معروضی تحقیق کے مطالبے ایک ہی جیسے ہیں، اپنے وقت کے امامیہ مسلک کے عالم اجل اور ادیب اکمل جناب مفتی میر محمد عباس شوستری نے اپنے خویش و جانشین نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب کو موعظت فرمائی تھی:

"... دیکھو جب کسی مطلب پر استدلال مقصود ہو اور کوئی مسئلہ زیر بحث ہو تو کبھی دلیل کو مدعی کے تابع نہ کرنا بلکہ ہمیشہ مدعی کو دلیل کا تابع رکھنا یعنی جو مدعا ہو اس کی دلیلوں میں نظر کرنا اور دلیل جس مقام پہ پہونچا دے اس مدعا کو حق سمجھنا۔ یہ نہ کرنا کہ مدعا کو اول نصب العین کر لو اس کے بعد استدلال۔ اس لیے کہ اس صورت میں کبھی حق نہیں مل سکتا۔ جب پہلے سے مدعا مان لیا جاتا ہے تو اگر جبال راسیات بھی اس کے خلاف آجائیں، انسان کچھ نہ کچھ ان کے ہٹا دینے میں زور لگائے گا اور صراط مستقیم سے دور ہوتا جائے گا۔" تجلیات حصہ

(۲) مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز ص ۳۱۸

جناب رشید حسن خاں اس وقت اردو تحقیق میں دھوم مچائے اور کوس لمن الملک الیوم بجا رہے ہیں۔ انہوں نے تحقیق و تدوین کے لوازم پہ بڑی مفصل گفتگو فرمائی ہے۔ "ادبی تحقیق۔ مسائل و تجزیہ" نام کے مجموعہ مضامین کے علاوہ کثیر التعداد تحریروں میں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ انہوں نے بھی تقریباً ایسی ہی احتیاطیں لازم ٹھہرائی ہیں۔ حضرت مفتی علامہ اور رشید حسن خاں کے موعظ و ارشاد کی روشنی میں ہاشم صاحب کے زیر نظر کارنامے کی پرکھ کی جائے تو جس صورت حال کا مواجہہ ہوگا وہ بڑی بھیانک ہے۔ یہاں ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

ہاشم صاحب نے سید صاحب کی تاریخ ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء جمعہ طے فرمائی ہے (ص ۴۰) اور یہ تقلید اعمیٰ کا بڑا روشن نمونہ ہے۔ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو جمعہ تھا ہی نہیں۔ سید علامہ کے قطعہ تاریخ ولادت کی جو سید صاحب کے جد ممجد کا نتیجہ فکر ہے، جو قرارت فرمائی ہے تو ۲۳ صفر کا بھی اثبات نہیں ہوتا۔ وہ مصرعہ جس میں صفر کی تاریخ بتائی گئی ہے اسے یوں نقل فرمایا گیا ہے

بشہر صفر چوں شدہ بود "سنہ"

یہ "سنہ" نہیں ہے "سہ" ہے، یعنی تین (۳) ہے تو پھر سید صاحب کی تاریخ ولادت ۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۸۸۴ء یوم جمعہ ماننا ہوگی۔ جمعہ سے مفر کی کوئی تدبیر نہیں۔ حکیم میر محمدی صاحب مرحوم نے صراحت فرمائی ہے:

بہ روز آدینہ بوقت سعید

تب یہ فرض کرنا لازم ہو جائے گا کہ تقویموں کا یہ اندراج کہ محرم ۱۳۰۲ تیس ۳۰ دن کا ہوا تھا غلط ہے اور فی الواقع صفر کی رویت ہلال ۲۹ محرم کو ہو گئی تھی اور ۳ صفر یوم جمعہ

۲۱ نومبر کو واقع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر اختر علی کے مضمون "سید سلیمان ندوی کی تاریخ ولادت" سے ایک اور صورت سامنے آتی ہے۔ یہ مضمون کسی پاکستانی جریدے میں شایع ہوا تھا۔ اس کی نشاندہی محب مکرم مولوی حافظ عمیر الصدیق دریابادی نے فرمائی اور اس کی عکسی نقل ارسال فرماکے ممنون کیا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اختر علی نے سید صاحب کی تاریخ ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء جمعۃ المبارک لکھی ہے۔ ڈاکٹر اختر کے استدلال میں وزن ہے کیونکہ وہ خود سید صاحب کے بیان پر بنا کرتے ہیں۔ یہ بیان مولوی عبدالحکیم دیسنوی کے نام ایک خط میں ہوا ہے۔ یہ خط معارف کے شمارہ بابت ستمبر ۱۹۶۰ء میں شایع ہوا ہے۔ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اسلام پور میں دادا مرحوم کا ایک "سفینہ" ملا۔ جس میں تمام اعزہ جو ان کے وقت میں تھے ان کی تاریخ ولادت اور وفات لکھی ہے۔ اس میں اتفاقاً میری پیدایش کی تاریخ بھی نکل آئی اور اتنی ہی نہیں بلکہ میری پیدایش کا قطعہ تاریخ بھی ان کا مصنفہ ملا۔ میں نے نقل کر لیا ہے۔ آخری مصرعہ ہے

شدہ مہر تاباں ز برج کمال

اس میں پانچ عدد کا تخرجہ ہے..."

المیہ یہ ہے کہ سید صاحب کے اس بیان کے باوجود ڈاکٹر اختر علی نے قطعہ تاریخ کی قرأت میں ڈاکٹر ہاشم سے بڑھ کے ٹھوکر کھائی۔ سید صاحب کے ارشاد سے مترشح ہوتا ہے کہ نثر میں بھی ۲۳ تاریخ کی صراحت ہے، مگر سید صاحب نے ۵ کا تخرجہ کیسے لکھا۔ کیا ۹ کو ۵ پڑھا گیا یا کیا؟ لہذا حافظ عمیر صاحب کو پھر زحمت دی کہ ستمبر ۶۰ کے معارف سے سید صاحبؒ کے

مکتوب گرامی کی نقل اور سفینے کے اندراج کی نقل مہیا فرمادیں۔ اس سفینے کو ڈاکٹر ہاشم نے دارالمصنفین کے کتب خانے میں دیکھا ہے اور بیاض کے نام سے اپنے مقالے میں ذکر فرمایا ہے۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا ہو سکتا ہے اس لفافے میں رہا ہو جسے مولانا اصلاحی صاحب نے میرے پاس بھیجا تھا اور جو نارسا رہا۔ ڈاک کی رفتار بھی میری قسمت کی نارسائی سے ہم آہنگ ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ سید صاحب کے مکتوب میں ۲۳ تاریخ صراحتاً ملاحظہ فرما لینے کے بعد بھی مصرعے میں تاریخ کی قرأت ڈاکٹر اختر علی نے یوں کی:

بشہر صفر چوں شدہ بود" سن"

معنویت کی طرف متوجہ نہ ہونا آج کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن ڈاکٹر ہاشم کے "سنہ" سے "سہ" کی طرف تبادر فوری ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اختر کا "سن" تو ہم ادنی طلاب کے سر پر سے سن سے گزر جاتا ہے۔ کوئی نابغہ ہی گرفت کر سکے تو کر سکے۔ اگر ڈاکٹر نے ۲۳ تاریخ تسلیم کر لی تھی تو ان کی مجبوری تھی کہ مصرعہ اس طرح پڑھیں:

بشہر صفر چوں شدہ "بست و سہ" (۲۳)

یہ سید صاحب کے بیان کو درست مان لینے کا منطقی نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کہ یہ دونوں ڈاکٹر صاحبان مغز سخن تک پہونچنے سے قاصر رہے اور قطعہ تاریخ کی مروجہ پیش کش میں ناکام رہے۔ مروجہ طریقہ یہ ہے ؎

بگفتا کہ بے داد (۹) شد مصرعہ — شدہ مہر تاباں ز برج کمال

۱۳۱۱ - ۹ = ۱۳۰۲

اگر تخرجہ نہ کیا جائے جیسا کہ ہاشم صاحب نے کیا ہے تو مصرعے کے اعداد ۱۳۱۱ ہوتے ہیں اور جیسا کہ اختر صاحب جناب سید صاحب کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ ۵ کا تخرجہ

ہے تو اعداد ۱۳۰۶ ہوتے ہیں۔

بندۂ خام کار پختہ وثوق سے اب بھی عرض نہیں کرسکتا کہ سفینے کی قرارت درست ہوئی ہے یا نہیں، لیکن صحت کے مفروضے پر ڈاکٹر اختر علی کی مستنبط تاریخ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء کا سید سلیمان ندوی کی تاریخ ولادت کے طور پر تسلیم کرلیا جانا اولیٰ ہے۔

اب تک ہاشم صاحب اشاروں کنایوں سے کام چلا رہے تھے۔ آخر میں کھل کھیلے اور سید صاحب کے ایسے کمالات کی نشاندہی میں لگ گئے جو ان کے زعم میں شبلی کے یہاں نہیں پائے جاتے اور "یہ بات سید صاحب کی زندگی کے ورق ورق میں بکھری ہوئی ملتی ہے"۔ (ص ۳۶۰)

بندۂ گستاخ اگر ڈاکٹر ہاشم کے موقف پر تجزیاتی نگاہ ڈالے تو وہ سید صاحب مرحوم کے عقیدت مندوں کے لیے دل آزار ہوسکتی ہے اور ادارۂ معارف کے لیے کشمکش کا باعث لہذا

کمیت قلم کی عناں کھینچتے ہیں

لیکن خاتمہ کلام میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر ہاشم کو شبلی اور سید سلیمان کے طول حیات میں جو بارہ (۱۲) سال کا فرق ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ۱۲ سال میں تو شبلی کے ایسا مرد کار نابغہ روزگار معلوم نہیں کیا کیا کر ڈالتا۔ میں سید صاحب کو الزام نہ دوں گا۔ بے چارے بھوپال تک یہ خیال دل سے لگائے رہے لیکن غالباً خدائے بخشندہ نے دار التکمیل کی تاسیس سید صاحب کو مقسوم ہی نہیں کی تھی۔ علامہ اور جی لیے ہوتے تو شاید اس کی تکمیل ہوجاتی۔

محض مدت حیات کی ہی بات نہیں ہے۔ دونوں کے حالات زندگی، صحت و مرض کے کوائف، خانگی مسائل، انفس وثمرات سے امتحان، اہلیہ کی جدائی، عقد ثانی پر فرزند اکبر کی آزردگی، بن باس، تین تین بھائیوں کی جوان مرگی اور نا وقت وفات، ضعیفی میں اولاد نرینہ کا

انعام پھر سلب نعمت سے امتحان۔ ندوہ کے رفقا کے ہاتھوں ناقدری، حکومت وقت کا عتاب، دربار بھوپال میں سیرۃ النبیؐ کے دفتر کی امداد بند کرانے کی سازشیں۔ غرض متعدد اور گوناگوں ذہنی و دماغی الجھنیں۔ یہ سب نگاہ میں رکھتے تو کج رائی کا شکار نہ ہوتے اور میری طرح بجا طور سے اس نتیجے پر پہنچتے کہ شبلی نعمانی اپنے کسی معاصر مسلمان سے مفضول نہ تھے، نہ آغا خاں، نہ سر سید، نہ جناح، نہ علی برادران اور نہ کسی اور سے۔

ہم نے تفاوت احوال کا خلاصہ نظر ارباب نظر کر دیا جس کی تفصیل حیات شبلی و حیات سلیمان میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، اب ناقد بصیر ہی طے کرے کہ کیا بہ ایں تفاوت موازنے کا کوئی محل ہے، سید صاحب بہ قید حیات ہوتے تو اسے کیا پسند فرماتے؟

یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ تقابلی مطالعے کا وقت تب آتا ہے جب شخصیت کی معرفت کامل ہوجائے۔ ابھی شبلی کی شخصیت سے ناشناسی کے لبادے ہی کہاں اترے ہیں تو تقابل و توازن کیسا؟ محقق عزیز فرماتے ہیں:۔

"سید صاحب شبلی کے ان تمام اوصاف و کمالات پر حاوی بھی تھے اور ان کے معبر بھی"۔

ہاشم صاحب کچھ اور نہ کرتے ان اعترافات کو تو ملحوظ خاطر رکھتے جو سید صاحب نے اپنے شخصیت ساز کے لیے کیے ہیں تو بھی "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا خانقاہی کاروبار تحقیق کے نام سے یونیورسٹی میں شروع نہ فرماتے۔ سید صاحب اپنی ذات پر استاد علامہ کے احسانات کے ذیل میں رقم طراز ہیں:۔

"دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو تعلیم کا سب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دست گیری فرمائی کہ حصول علم اور شوق مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشے سے ہٹا کر علم و فن کے

آستانے پر کھڑا کر دیا ۔۔" (حیات شبلی ص۳ متن کتاب)

ہاشم صاحب کا سید صاحب کو شبلی کے تمام اوصاف و کمالات پر حاوی اور ان سے بڑا مبصر، سیاست داں، صحافی، ماہر تعلیم، محقق اور ماہر لسانیات قرار دینا محض بلا دلیل ہے۔ ہم تو بہ پاس خاطر نازک مزاجاں اس وادی پُر خار سے سلامت گزر گئے۔ اگر کوئی صاحب اس بحث کو بڑھانا چاہیں تو ہم حاضر ہیں۔ ہم کو دونوں شخصیتیں عزیز ہی نہیں عزیز تر ہیں، اگر یہ واضح رہے کہ سید سلیمان شبلی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ان کا یہ شرف نہیں کہ وہ کلی یا جزوی طور پر علامہ شبلی سے برتر تھے، ان کا اصل شرف ہے کہ جو کام مولانا شبلی خود نہ کرنا چاہتے یا کسی وجہ سے نہ کر پاتے تھے۔ اس کام کے لیے ان کی نظر سید سلیمان ہی پر پڑتی تھی۔ اپنے سوانح کے لیے بھی کیا۔ سیرۃ النبی ایسے عظیم و تاریخ ساز کارنامے کے لیے بھی کیا۔ وہ فخر استاد شاگرد تھے، مگر شاگرد ہی تھے، حریف نہیں تھے۔

ہاشم صاحب اپنے پورے مقالہ میں کسی غیر مطبوعہ مواد کا استعمال نہ کر سکے۔ نہ کوئی نادر و تازہ حوالہ دے سکے تو اپنی تحقیق کا حاصل یہی قرار دیا کہ وہ استاد پر شاگرد کی برتری کا دعویٰ کر دیں۔

کتاب التاجی

از مولوی حافظ عمیر الصدیق ندوی

المنتزع من الجزء الاول من الکتاب المعروف بالتاجی (عربی و انگریزی) از جناب ڈاکٹر محمد صابر خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۵، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، مدینۃ الحکمت، شارع محمد بن قاسم، کراچی پاکستان۔

چوتھی صدی ہجری میں خلافت عباسیہ کے ضعف و انحلال کے نتیجے میں مختلف علاقائی اور قبائلی طاقتیں ابھرنا شروع ہوئیں، دیلم و جیلان کے نومسلم شیعہ قبیلے کا ظہور اور بنو بویہ کی شکل میں اس کا عروج اسی زمانے کا اہم واقعہ ہے جس نے خلافت عباسیہ کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی، عماد الدولہ، معز الدولہ، عز الدولہ جیسی شان و شوکت کے امراء کے بعد عضد الدولہ جیسا جامع اوصاف فرماں روا ان کا جانشین ہوا جو عقل و دانش، تدبیر و سیاست، شجاعت و شہامت، فضل و کمال، علم نوازی اور علماء پروری وغیرہ مختلف اوصاف جہانبانی میں یگانہ تھا، نحو میں کتاب الایضاح والتکملہ، قرأت میں حجۃ، طب میں ملکی، اصول تاریخ میں تجارب الامم اور تاریخ میں کتاب التاجی جیسی اہم کتابیں اسی کی توجہ و عنایت کا نتیجہ ہیں، کتاب التاجی کو ابواسحاق ابراہیم بن ہلال الصابی نے عضد الدولہ کی فرمائش پر تالیف کیا تھا اور اس کے لقب تاج الملۃ کی مناسبت سے اسے "الکتاب التاجی فی اخبار و آثار الدولۃ الدیلمیہ" کا نام دیا جو کتاب التاجی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے حوالے دیلمیوں کی معاصر اور مابعد کتب تاریخ میں ملتے ہیں، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ایک زمانہ تک اس کے مفقود رہنے کی وجہ سے یہ باور کر لیا گیا تھا کہ دوسرے قدیم اسلامی ورثہ کے مانند یہ بھی اب کنز مخفی ہو چکی ہے، ۱۹۵۴ء میں عرب لیگ کے ثقافتی شعبہ کو صنعاء (یمن) کے مکتبہ متوکلیہ میں اس کا ایک ملخص مخطوطہ ہاتھ لگا جو فقہ زیدیہ کے ایک مخطوطہ کے آخر میں شامل تھا، المنتزع من الجزء الاول من الکتاب المعروف بالتاجی نامی اس مخطوطہ کی مائکروفلم بھی دار الکتب المصریہ قاہرہ میں محفوظ کر دی گئی، لیکن ابھی تک یہ اہم مخطوطہ کسی صاحب نظر کی نگاہ اعتناء کا منتظر تھا، حسن اتفاق سے اس نایاب اور اہم مخطوطہ کی تحقیق و تصحیح و تعلیق اور انگریزی زبان میں اس کے ترجمہ کا تاج شرف و

سعادت فاضل محقق ڈاکٹر محمد صابر خاں کی قسمت میں آیا جو اپنے بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین وکتب کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں، اس سے پہلے مسکویہ کے متعلق ان کی ایک کتاب بھی شکاگو سے اسٹڈیز ان مسکویس کنٹمپریری ہسٹری شایع ہو چکی ہے، مخطوطات سے ڈاکٹر خان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے عربی مخطوطات کی ایک فہرست بھی مرتب کر کے شایع کی ہے، علوم عربیہ سے ان کے شغف کا اندازہ ان کی ایک اور کتاب ببلوگرافی آف عربک سورسز فار دی ہسٹری آف سائنٹسٹس اینڈ سائنس سے ہوتا ہے، ان کے اسی علمی و تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی اس نادر و نایاب مخطوطہ کی تحقیق و تحشیہ اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ اشاعت بھی ہے۔ ۴۶ صفحات پر مشتمل یہ مخطوطہ گو کامل ہے تاہم پہلے صفحہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ملخص و کاتب کا نام اور سنہ کتابت کا یقینی پتہ نہیں چل سکا، تاہم طرز تحریر و کتابت اور ایک صفحہ پر ۶۰۵ھ مرقوم ہونے کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، دیلم وجیلان کی ابتدائی تاریخ پر کم لکھا گیا ہے، اس کتاب میں اختصار کے باوجود طبرستان کے زیدی ائمہ اور دیالمہ کے عام حالات اور بنو بویہ، امرائے زیدیہ اور بنو سامان کے علاوہ بنو باورسقان، بنو سالار، بنو کنکرا اور بنو ہسودان کے مقامی امراء کے متعلق جو معلومات درج ہیں ان سے عام کتب تاریخ خالی ہیں۔

اصل عربی متن بہ شمول فہرست اسماء و قبائل واماکن اور مقدمہ مرتب، ۶۰ صفحات کو محیط ہے لیکن اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ اس کے انگریزی حصہ سے ہوتا ہے، جو ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، ۴۴ صفحات میں انگریزی ترجمہ اور ۳۰ صفحوں میں کتابیات کے علاوہ ۹۲ صفحات میں حواشی و تعلیقات ہیں، باقی ۸۰ صفحات میں مقدمہ ہے، جو تین

فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی فصل میں مخطوطہ کی دستیابی کی سرگزشت اس کی طرز کتابت اور سنہ کتابت کے تعین اور مرتب کے حالات و سنہ تالیف، کتاب کی روایات کی صداقت و استناد پر بحث کی گئی ہے، فاضل مرتب کے خیال میں مکمل کتاب التاجی کی دریافت ہی اس مخطوطہ کے مضامین کی صداقت کو متعین کر سکتی ہے، تاہم اس کی روایات وواقعات کے معتبر و مستند ہونے کے قرائن و دلائل موجود ہیں اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسری فصل میں مخطوطہ کے مندرجات، مصادر و ماخذ خصوصاً طبرستان کے امرائے علویہ کے متعلق معلومات زیر بحث آئے ہیں، فاضل محقق کے مطالعہ، تلاش و جستجو اور ان کی جاں کاہی و دقت نظری کا یہ بہترین نمونہ ہے، اس میں انہوں نے اس عہد کے مورخین کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ مورخین جن پر حدیث و فقہ اور مذہبی رجحانات غالب ہیں، اس طبقہ کے سرخیل مورخ طبری ہیں، دوسرے وہ جن کو سیکولر کہا جا سکتا ہے ان میں سنان بن ثابت بن قرہ، ثابت بن سنان اور مسکویہ اور خود ابو اسحٰق الصابی وغیرہ ہیں، اس طبقہ کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ حکومت کے انتظامی ادارے دیوان یا براہ راست دربار سے وابستہ رہے، ابو اسحٰق اور مسکویہ دونوں عضد الدولہ کے دربار سے متعلق تھے، مسکویہ کی تجارب اور الصابی کی تاجی میں فرق یہ ہے کہ مسکویہ نے اپنی خواہش سے کتاب مرتب کی، جبکہ الصابی نے عضد الدولہ کی فرمائش کی تعمیل کی۔ اس لیے اس نے واقعات کو ہمیشہ بنو بویہ کے نقطہ نظر سے دیکھا، وہ دوسرے عربی مورخین کے برخلاف کسی واقعہ کے متعدد پہلوؤں کو نہیں بیان کرتا، کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل محقق اصل کتاب التاجی پر تبصرہ کر رہے ہیں، جس کا احساس غالباً ان کو بھی ہوتا ہے، اس لیے معاً بعد وہ پھر لکھتے ہیں کہ محض اس ملخص مخطوطہ کی بنیاد پر کسی حتمی رائے کا اظہار درست نہیں۔ اس فصل میں

انہوں نے اس عہد کی تاریخوں اور کتاب التاجی کے مضامین کا موازنہ و مقابلہ بھی کیا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے عربی و فارسی کی اکثر اہم تاریخوں، تذکروں حتی کہ کتب ادبیات کے حوالہ سے دیلم وطبرستان وجیلان کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے، اس طرح یہ فصل اس علاقہ کی سیاسی تاریخ کا مفصل مطالعہ ہے جو زائد ہونے کے باوجود غیر ضروری اور بے فائدہ نہیں ہے۔ مقدمہ کی تیسری فصل میں اس مخطوطہ کے قابل اعتماد و استناد ہونے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہوئے فاضل محقق نے تسلیم کیا ہے کہ یہ مشکل اور دشوار مرحلہ ہے، کیونکہ صرف چند عربی و فارسی مصادر ہی میں کتاب التاجی کے متعلق مواد موجود ہے اور خود صابی کا یہ بیان کہ اس نے دانستہ التاجی میں غلط بیانیاں کی ہیں، بہر حال فاضل محقق نے مالہ وما علیہ کا جائزہ غیر جانب دارانہ اور معتدل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طویل اور پُر مغز مقدمہ کے علاوہ ۹۲ صفحات پر مشتمل حواشی و تعلیقات بھی ان کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہیں جو ارض دیلم اور بنو بویہ کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے کتابیات میں ۴۰۶ مراجع کا ذکر محقق کی سعی و کاوش اور کتاب کے بیش قیمت ہونے کا ثبوت ہے۔

جناب حکیم محمد سعید نے اس کتاب کو شایع کرکے علوم اسلامیہ میں اسلامی ہند کے قدیم فیضان کی روایت کی پاسداری کی ہے، البتہ سرورق پر پہلی ہی سطر میں المنتزع کے بجائے المنتز اور بن ہلال کی جگہ بن الکاتب کے سہو کا داغ لگ گیا، گو اس سے کتاب کے حسن ظاہری و معنوی پر اثر نہیں پڑا

ادبیات

غزل

از

جناب رئیس نعمانی صاحب، علی گڑھ

ای خراباتِ دل و جانها درایوانِ شما
باز تشنه کام می گردند رندانِ شما

طالبانِ حسن را با وصل و با ہجران چه کار
بس بود بهرِ دل شان، سحرِ پیمانِ شما

گر نمی خواهد رہائی، نیست جای حیرتی
یوسفی کو هست بی جرمی به زندانِ شما

دیده و دل، جسم و جان، احساس و افکارِ لطیف
هر چه دارم هست از انعام و از آنِ شما

کی رسد یارب به ساحل زورقِ اندیشه ام
زانکه خود در جست از دستم به طوفانِ شما

در شهادت گاهِ الفت بی گناهم کشته اند
صد سپاس و شکر و منت، ردِّ احسانِ شما

آبِ از جو رفته باز آید به جو، بشنیده اید؟
چون به عقلِ خویش باز آیند مستانِ شما

چاره سازان بر مرادِ خود چسان فایز شوند؟
درد، دردِ ماست، درمان است درمانِ شما

تا به کی شبهائی امیدم نبیند روی صبح؟
ای که مهر و ماه می گردد به فرمانِ شما

گر بتابد پرتوی از نور در کاشانه ام
کم نگردد تابشی از روی تابانِ شما

قلبِ زارم هم به امیدِ قضاوت می تپد
قضیه ها فیصل همی گردد به دیوانِ شما

این رئیس بینوا هم بانوا گردد، اگر
راست آید کارکی در دوِ پریشانِ شما

مطبوعات جدیدہ

قرآنی معارف از جناب مولانا محمد نظر علی خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۵، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: جلالی اکیڈمی، ۱۰۳۶، بی، گلی مدرسہ حسین بخش، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

قرآن مجید اور اس کے علوم و معارف پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور اس میں ایک بہترین اضافہ ہے، اصلاً یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ قرآن مجید اور اس کے علوم کی تاریخ ہے جس میں قرآن مجید کے اسماء و معانی و فضائل، زمانۂ نزول، کیفیاتِ وحی، جمع و تدوین کے علاوہ کتابت و قراءت سبعہ، مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم، ناسخ و منسوخ، عہدِ صحابہ و تابعین میں تفسیر کے مناہج جیسے اہم مباحث کو بڑے اختصار و جامعیت اور مستند معلومات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، دوسرا حصہ تراجم و تفاسیر سے متعلق ہے جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور بنگالی زبان کے قریباً تمام اہم مفسرین و مترجمین کی کاوشوں کا استقصار کیا گیا ہے، اس باب میں ہندوستان کے قدیم و جدید مفسرین کے متعلق پُر از معلومات بحث میں چند غیر معروف لیکن بعض حیثیتوں سے اہم تفسیروں کا ذکر آگیا ہے، مثلاً صاحبزادہ علی عباس خاں رامپوری کی تفسیر سورۂ یوسف جو فیضی کی سواطع الالہام کی طرح غیر منقوط ہے اور فاضل مصنف کی نظر میں سواطع الالہام کے اکثر اشکالات کے برخلاف یہ سلیس و سادہ ہے، ایک باب میں اثنا عشری مفسرین کا ذکر ہے، جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انکا زاویۂ نگاہ معتزلہ کا ہے، خصوصاً ان نصوص میں جو علم الکلام کے مسائل سے مربوط ہیں وجہ یہ ہے کہ

اکثر یہ علمائے امامیہ معتزلہ کے شاگرد تھے، ایک اور باب میں بعض صوفیہ مفسرین کی تفسیروں کا تعارف ہے، اس میں ابن عربی کی تفسیر کا ذکر تفصیل سے ہے لیکن خود فاضل مصنف ابن عربی سے اس تفسیر کی نسبت کو صحیح نہیں مانتے۔ ہر تفسیر کے خصائص و امتیازات کے علاوہ صاحب تفسیر کے سوانح و دیگر کمالات علمی بھی پیش کر دیے گئے ہیں، ممکن ہے عصر حاضر کے مفسروں کے متعلق ان کا یہ خیال محل نظر سمجھا جائے کہ ان کے ہاں کوئی جدت نہیں کیونکہ متقدمین نے ان متاخرین کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تاہم ان تفسیروں کے اوصاف و خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے، اردو تفسیروں اور ترجموں کا تعارف نسبتاً زیادہ مفصل ہے، فاضل مصنف کے خیال میں ان کے استاد مولانا سید عبد الدائم جلالی کی تفسیر بیان السبحان موجودہ دور کی بہترین تفسیر ہے، جس کو شایانِ شان شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمہ قرآن کنز الایمان پر تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے، جس میں فاضل بریلوی کے اعتراف کمال اور نسبت "پھنولی" کے اشتراک کے باوجود واضح کیا گیا کہ خاں صاحب کے ہاتھ سے دامنِ احتیاط کئی بار چھوٹا ہے اور انہوں نے بعض ایسے الفاظ اور جملے سپرد قلم کیے جو ترجمہ سے مناسبت نہیں رکھتے، اردو کے بعض منظوم تراجم کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بلاشبہ اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں مختلف زبانوں کے تراجم اور تفسیروں کا اس جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے، علوم القرآن سے شغف رکھنے والوں کے لیے یہ موسوعہ اور انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، مگر ان کا دعویٰ کہ "تراجم و تفاسیر کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے"۔ بغیر کسی مستند حوالہ کے مبالغہ آمیز سمجھا جائے گا۔

خطبات اقبال از جناب محمد شریف بقا، متوسط تقطیع بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی،

پاکستان، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کے موضوع پر علامہ اقبال کے بلند پایہ عالمانہ و فلسفیانہ خطبات محتاج تعارف نہیں، فلسفہ زمان و مکان، مادیت و عقلیت، نظریہ ارتقا، مسئلہ بقائے روح، جبر و قدر اور حقیقت کائنات جیسے مذہبی، سائنسی اور عقلی مباحث پر مشتمل ان خطبات کو سمجھنا آسان نہیں، فاضل مولف کو یہ احساس ہے کہ یہ خطبات لاجواب اور مشرقی و مغربی علوم پر حاوی ہیں، اور ان میں ان تمام مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ بڑا گہرا ہے، اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے ان خطبات کے اہم نکات کی تشریح سادہ اور آسان زبان میں اس جذبہ سے کی ہے کہ عام لوگ بھی اس سے فیضیاب ہوسکیں اور یہ غلط فہمی بھی دور ہو کہ یہ خطبات ناقابل فہم اور دقیق ہیں، اس کتاب سے یہ مقصد بخوبی حاصل ہوگیا ہے۔

ندوۃ العلماء محرک و بانی؟

از جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری و جناب مولوی نجیب اصغر فتحپوری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت مناسب صفحات ۱۵۲، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: جبلی بک ڈپو، پریڈ، کانپور، یوپی۔

تحریک ندوۃ العلماء کے بانی و محرک کی تلاش و تعیین میں یہ دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے، عموماً ندوہ کے بانی کی حیثیت سے مولانا محمد علی مونگیری کا نام نامی پیش کیا جاتا ہے مگر اس کتاب میں خاصی محنت سے ایسے حوالہ جات تلاش کیے گئے ہیں جن سے بنا و تاسیس کا شرف اولیت مولانا حکیم سید ظہور الاسلام فتحپوری کو حاصل ہوتا ہے، ان کے شاگرد اور صاحب البرامکہ مولانا عبدالرزاق کانپوری کی یاد ایام اس دعویٰ کا سب سے اہم ثبوت ہے، مولانا مونگیری کو ناظم اول کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں

ندوہ کی ابتدائی تاریخ پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور خصوصیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ اہالیان فتحپور ندوہ کیلیے سرگرم تعاون اور مخلصانہ جدوجہد میں پیش پیش رہتے ہیں، بعض کتابوں اور خیالات کے تسامحات پر گرفت بھی کی گئی ہے، تاریخ ندوہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

نوائے دید

از جناب پروفیسر سید حسنین عظیم آبادی، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۰۰، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴، بہار۔

دہلی و لکھنؤ اور حیدرآباد کی طرح کبھی مرشد آباد بھی مسلم بنگالہ میں علم، ادب، تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، نواب مرشد قلی خاں کے عہد میں یہ رشک شیراز ور ے بن گیا تھا، بعد میں سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کا انتساب بد بھی اس کی تقدیر میں آیا، زیر نظر کتاب اسی شہر مرحوم کا سفرنامہ ہے اور رپورتاژ کی دلکش ادبی شکل میں ہے، فاضل روداد نگار اپنے رفیق سفر سید حسن عسکری کے ہمراہ نظامت لائبریری کے چند مخطوطات سے استفادہ کی غرض سے وہاں گئے، جو کچھ دیکھا دل پر اس کا خاص اثر محسوس کیا، ایک مسجد کی سیڑھیوں تلے مرشد قلی خاں کی قبر دیکھی، معلوم ہوا کہ وصیت کی تھی کہ ہر نمازی کے تلوؤں کی خاک ان کے جسم پر پڑتی رہے، یہ پورا بیان پُراثر انداز سے لکھا گیا ہے، طرز نگارش کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، "گم سم ڈیوڑھیاں، شکستہ برجیاں، سنسان صحن باغ، ویران پائیں باغ دیدۂ بے تاب کو روک لیتے کہ ٹھہرو، غور سے دیکھو یہ مکانات، یہ عمارات اور ان سے آباد یہ محلے اور ان سجے ہوئے گلزار محلوں کا یہ مرشد آباد کبھی رشکِ فردوس تھا۔"

اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے

از جناب ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، متوسط

تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰، قیمت ۳۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، کاشانہ، کل گاؤں ۴۴۵۲۰۳۔

اس کتاب میں ارض مراٹھا مہاراشٹر کی معاشرتی و ادبی زندگی میں مراٹھی اور مسلم تہذیب و ثقافت کے باہمی ارتباط و اثر پذیری کو موضوع بنایا گیا ہے، یہ خطہ آٹھویں صدی عیسوی ہی میں مسلمانوں کے وجود سے آشنا ہو گیا تھا، یہاں کے راجاؤں کا ذکر مسلمانوں کے قدیم تاریخی عربی مصادر میں موجود ہے، بعد میں حضرات صوفیہ کے ذریعہ عام ہندو اور مسلمان ملک کے دوسرے خطوں کی طرح یہاں بھی باہم قریب اور سماجی زندگی میں شریک ہوئے، مراٹھی زبان پر اس اختلاط کے واضح اثرات موجود ہیں، فاضل مصنف نے ایک مضمون میں ان اثرات کے جائزہ بڑی خوبی سے لیا ہے اور مراٹھی کے قدیم شاعر مرتیونجیہ جن کا اصل نام شاہ مرتضیٰ ہے کی مراٹھی اردو لغت کو اس رشتۂ اتحاد کی پہلی مثال قرار دیا ہے، باقی پانچ اور مضامین میں مراٹھی کے مسلم شعراء کی اردو کاوشوں، اردو مراٹھی ثقافتی ہم آہنگی، مراٹھی سنتوں کی اردو دانی وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، آخری مضمون مراٹھی شاعری کے عروض و بحور پر ہے جن میں کئی بحریں اردو سے مماثل ہیں، فاضل مولف کا یہ خیال درست ہے کہ اردو میں ان موضوعات پر پہلی بار خامہ فرسائی کی گئی ہے، مولف کا مزاج تحقیقی اور اسلوب شگفتہ ہے، ملک کی علاقائی زبانوں اور اردو کے ربط و رشتہ کے تعلق سے توقع ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی۔

ع۔ ص۔